(دائیں سے) والدہ رومیلڈا، صوفیہ لورین اور چھوٹی بہن ماریا

قسط :01

آج کل میں یورپ میں رہائش پذیر ہوں۔ اُس روز میں اپنے اپارٹمنٹ کے کچن میں ایک خاص قسم کی اطالوی پیسٹریاں تیار کرنے کے لیے میدے میں پانی ملا کر اسے گوندھ رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ایپرن پر ہاتھ پونچھے اور جلدی سے دروازے پر پہنچی۔ دروازہ کھولتے ہی میں نے کوریئر کو سامنے کھڑا پایا۔ وہ بڑا سا ایک گلدستہ اٹھائے، اس کے عقب سے، مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''یہ آپ کے لیے ہے سینورا صوفیہ لورین......!'' اس نے گلدستہ میری طرف بڑھایا پھر وصولی کی رسید میرے سامنے کرتے ہوئے خوش دلی سے بولا ''اس پر اپنے آٹوگراف دے دیجیے۔''

میں نے رسید پر دستخط کردیے اور کوریئر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، گلدستے سے منسلک کارڈ پر نظر ڈالی۔ وہ اٹلی سے میری ایک کزن نے بھیجا تھا۔ کرسمس کی آمد آمد تھی اور دنیا کے متعدد ممالک سے میرے لیے گلدستے اور مبارکباد کے پیغامات آتے چلے جارہے تھے۔ گھر میں میرے پوتے اور پوتیاں آئی ہوئی تھیں۔ میرے عقب سے ان کی مدھم سی چیخ وپکار سنائی دے رہی تھی۔ آنے والی کل تک امریکا سے ان کے والدین، یعنی میرے دونوں بیٹے اور ان کی بیویاں بھی پہنچنے والی تھیں۔ میرے کچھ اور قریبی عزیز بھی آرہے تھے۔ میں نے حساب لگایا، کل تک میرے گھر میں مہمانوں کی تعداد مجموعی طور پر سترہ ہونے والی تھی۔ میں قدرے فکر مندی سے سوچ رہی تھی کہ اتنے مہمانوں کو میں کیسے سنبھالوں گی؟ ان کے لیے کھانے پینے کی کون کون سی چیزیں تیار کروں گی؟ میں زیادہ تر اطالوی ڈشز تیار کرنا چاہتی تھی لیکن صحیح طور پر اندازہ نہیں کر پارہی تھی کہ بچوں اور بڑوں کو ان میں سے کون سی ڈشیں پسند آئیں گی اور کون سی نہیں؟

میں کچن میں لوٹ آئی اور کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگی لیکن مجھ میں گویا قوت فیصلہ ہی نہیں رہی تھی۔ زیادہ سوچنے سے مجھے اپنا سر گھومتا محسوس ہونے لگا۔ تب میں ڈائننگ ہال میں آگئی تاکہ ذہن کچھ بٹ سکے لیکن وہاں آکر مجھے نئی فکر لاحق ہوگئی۔ میں کھانے کی میز کس انداز میں سجاؤں گی؟ کس مہمان کو کس کرسی پر بٹھاؤں گی؟ کرسمس پر ہر سال میرا پورا خاندان جمع ہوتا ہے۔ پورے سال میں یہی ایک موقع ہوتا ہے جب ہم سب اکٹھے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ دن میرے لیے بہت خاص ہوتے ہیں اور چھوٹے سے لے کر بڑے تک، سب مہمان بھی میرے لیے بہت ہی خاص ہوتے ہیں۔ میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے، کسے کہاں بٹھاؤں، کیا کھلاؤں، کیا پلاؤں، کس طرح اس کی خاطر مدارت کروں، کس طرح اسے احساس دلاؤں کہ میں اس سے کتنا پیار کرتی ہوں؟

میرا برج سنبلہ ہے۔ شاید اسی لیے میں نہایت ''کاملیت پسند'' (Perfectionist) ہوں۔ ہر کام انتہائی سلیقے سے، قطعی بے عیب طریقے سے کرنے کے لیے کوشاں رہتی ہوں۔ مجھ جیسے لوگوں کی یہ کوشش کامیاب ہو پائے یا نہیں...... لیکن وہ اپنی اس کوشش کی وجہ سے اکثر خود کو بڑی مشکل میں اور بڑی مصیبت میں مبتلا رکھتے ہیں۔ آج تو میرے لیے فیصلہ کرنا بہت ہی مشکل ہو رہا تھا کہ میں کس طرح مہمانداری اپنے مزاج اور خواہشات کے مطابق کر پاؤں گی؟

آخر کار میں نے گویا مدد طلب کرنے کے لیے اپنے آنجہانی شوہر کارلو پونٹی کی تصویر کی طرف دیکھا جو نقرئی فریم میں، کیبنٹ کے اوپر سجی ہوئی تھی۔ یہ ہماری شادی کی تصویر تھی جس میں وہ اپنی مخصوص، مہربان مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اپنی نوجوانی کے اس دن کو کبھی فراموش نہیں کرسکوں گی جب اس نے پہلی بار ایسی ہی مہربان نظروں سے میری طرف دیکھا تھا اور مجھے اچانک احساس ہوا تھا کہ شاید کوئی بہت ہی خاص انداز میں میری طرف دیکھ رہا ہے۔

یہ بہت برسوں پہلے کی بات ہے۔ میں اس وقت ایک ریسٹورنٹ میں کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھی تھی جب مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ کسی کی نظریں مجھ پر مرتکز ہیں۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تھا اور کارلو پونٹی کو گہری نظروں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا۔ میں اس وقت کامیابیوں کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی محض ایک نوجوان اور ناتجربہ کار لڑکی تھی جبکہ وہ ایک کامیاب فلم پروڈیوسر اور بزنس مین تھا۔ کچھ دیر بعد ویٹر نے مجھے ایک چٹ لاکر دی۔ یہ چٹ کارلو پونٹی نے ہی بھیجی تھی۔ اس نے صرف اتنا لکھا تھا کہ بطور پروڈیوسر اسے میری شکل صورت اور شخصیت اچھی لگی ہے، اگر میں مناسب سمجھوں تو اس سے ملاقات کرلوں۔

میں نے اس سے ملاقات کی تھی۔ یہ ملاقات ایک ہوٹل کے سبزہ زار پر ٹہلتے ہوئے ہوئی تھی۔ ہمارے اردگرد خوبصورت پودوں پر رنگارنگ پھول کھلے ہوئے تھے اور ان کی ملی جلی خوشبوئیں فضا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس چہل قدمی کے دوران بہت سی باتیں ہوئی تھیں...... اور یہ گویا ہماری آئندہ کی پوری زندگی پر پھیلے ہوئے ایک نہایت حسین اور ناقابل شکست تعلق کی ابتدا تھی...... یا پھر شاید ہم دونوں ہی کے لیے ایک نئی زندگی کا آغاز تھا۔

اس دن کے بارے میں سوچتے ہوئے میں بے خیالی کے سے انداز میں اس آرام کرسی کے ہتھے کو سہلانے لگی جس پر بیٹھ کر اخبار پڑھتے پڑھتے کارلو اونگھنے لگتا تھا۔ شاید میں یادوں کی وادی میں بھٹکتی ہوئی بہت دور نکل جاتی لیکن اس دوران میری سب سے چھوٹی پوتی بیٹرائس چیختی ہوئی ڈائننگ روم میں آگئی۔ اس کی آواز نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔ ''دادی صوفیہ...... دادی صوفیہ......!''

میری اس پوتی کے بال، میری ماں کی طرح بہت زیادہ سنہرے ہیں اور یہ ضد کی بڑی پکی ہے۔ اس کے عقب میں، ایک بیڈ روم کے دروازے سے میری دوسری پوتی اور دو پوتوں کے چہرے بھی جھانک رہے تھے۔ ان کے چہروں پر ہمیشہ کی طرح شرارت تھی۔ یہ چاروں ہی بلا کے شریر ہیں لیکن ان کی معصوم شرارتیں اب میری زندگی ہیں۔ میں ان چاروں کو ''شیطانوں کا ٹولا'' کہتی ہوں اور کبھی کبھار دکھاوے کے لیے ان پر آنکھیں بھی نکالتی ہوں لیکن دل کی آنکھوں سے یہ مجھے ننھے فرشتے دکھائی دیتے ہیں اور اگر ان کے معصومانہ انداز واطوار کو میں ان کی شرارتیں قرار دے بھی دوں، تب بھی دل ہی دل میں میری رائے یہی ہے کہ انہی شرارتوں کی وجہ سے اب میری زندگی میں دلکشی ہے۔ عمر کے اعتبار سے یہ میری زندگی کا خزاں کا دور ہے لیکن ان بچوں کی بدولت میری زندگی میں بہار ہے، انہی کے دم سے روز وشب میں دلکشی ہے۔ جب یہ میرے گھر میں آتے ہیں تو نہ جانے کتنی رونقیں ان کے ساتھ چلی آتی ہیں۔

میں نے بڑے غور سے اپنی دونوں پوتیوں اور دونوں پوتوں کو دیکھا۔ ان کی معصوم آنکھوں میں گو کہ شرارت کی چمک تھی لیکن اس کے ساتھ ایک معصوم سی التجا بھی تھی۔ میں اس التجا کو سمجھ گئی، ان کے دل کی بات جان گئی۔ ان کی خواہش کو میں نے خود اپنی طرف سے ایک سوال کی شکل دے دی۔

''کیوں نہ ہم کوئی فلم دیکھیں؟'' میں نے کہا۔

چاروں بچوں نے بے اختیار، خوشی سے چیخیں ماریں اور فوراً ہی ان کے درمیان اس موضوع پر بحث شروع ہوگئی کہ کون سی کارٹون فلم دیکھی جائے؟ آخرکار چاروں بچے "Cars2" کے نام پر متفق ہوگئے۔ ہم سب ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئے اور میں نے ان کی اس وقت کی پسندیدہ فلم لگادی۔ اس فلم میں ''ماما ٹوپولینو'' نامی ننھی سی کار کے مکالمے میری آواز میں ڈب ہوئے ہیں۔ بچوں کو یہ بات معلوم ہے اور وہ میری آواز کو پہچانتے بھی ہیں۔ کار کو میری آواز میں بولتے سن کر وہ مسرت بھرے نعرے بلند کرتے ہیں۔ میں نے ڈبنگ کے اس کام کے لیے بہت ہچکچاتے ہوئے ہامی بھری تھی لیکن اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری پوتیاں اور پوتے اس کار کے ''منہ'' سے میری آواز سن کر اتنے خوش ہوا کریں گے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں ذرا بھی نہ ہچکچاتی اور فوراً ہی خوشی خوشی یہ کام کر گزرتی۔

میرے ایک پوتے کا نام وٹوریو اور اس کی بہن کا نام لوسیا ہے۔ دوسرے پوتے کا نام لیو اور اس کی بہن کا نام بیٹرائس ہے۔ یہ چاروں میرے دو بیٹوں کی اولاد ہیں۔ چاروں بچے گو کہ اپنی پسندیدہ فلم دیکھ رہے تھے لیکن فلم کا بہرحال اپنا ایک جادو بھی ہوتا ہے اور پھر رات بھی خاصی بیت چکی تھی۔ تھوڑی دیر میں چاروں بچے نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ اس دوران باہر برفباری شروع ہوچکی تھی لیکن میں اپنے خیالات میں کھوئی رہی تھی، مجھے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

کل میرے گھر میں بہت سے لوگ آنے والے تھے۔ میں انہی کے بارے میں سوچے جارہی تھی۔ لوگوں کا آنا اور جانا بہت سی بھولی بسری یادوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ میں جب اپنی اب تک کی زندگی کے بارے میں سوچتی ہوں تو گزرا ہوا زمانہ مجھے خواب سا لگتا ہے۔ میں اکثر حیرت سے سوچتی ہوں، کیا واقعی یہ سب کچھ مجھ پر بیتا ہے؟ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں یہ زندگی خواب میں ہی گزار رہی ہوں، کسی روز اچانک میری آنکھ کھلے گی اور سب کچھ بدل جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ میری زندگی میں بہت سی دشواریاں بھی آئیں، میں نے بارہا بڑا کٹھن وقت بھی دیکھا، بہت دکھ بھی اٹھائے لیکن اب میں ان کے بارے میں سوچ کر افسردہ یا سوگوار نہیں ہوتی بلکہ اپنے آپ کو سمجھاتی ہوں کہ شاید اسی کا نام زندگی ہے، یہ سب کچھ زندگی کا حصہ ہے اور یہ صرف میرے ساتھ ہی نہیں ہوا بلکہ دنیا میں نہ جانے کتنے لوگوں کے ساتھ کیا کچھ ہوتا ہے۔ میں کم از کم اس اعتبار سے خوش نصیب ہوں کہ مجھے دکھوں، تکلیفوں، دشواریوں اور بے پناہ جدوجہد کے بعد منزل تو مل گئی، بہت سی خوشیاں، راحتیں اور آسائشیں بھی میرے حصے میں آئیں۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب تو ہوگئی۔ کامیابی کا اپنا بھی ایک بوجھ ہوتا ہے۔ کامیابی بھی ایک قسم کی ذمے داری کی طرح ہوتی ہے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ اس ذمے داری کا بوجھ بھی خوش اسلوبی سے اٹھانے میں کامیاب رہی۔ ورنہ اس دنیا میں بے شمار لوگوں کو تو، بے پناہ محنت کرنے کے باوجود کوئی خاص کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔

بچوں کو سوتا چھوڑ کر میں دبے قدموں اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ میں اب کچھ وقت تنہائی اور خاموشی میں گزارنا چاہتی تھی۔ میں جب کسی خاموش جگہ پر تنہا ہوتی ہوں تو اپنے دل کی دھڑکنیں بھی سن سکتی ہوں۔ بیڈ روم میں پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ میں ابھی تک ایپرن باندھے ہوئے تھی۔ میں نے اسے اتار کر ایک طرف رکھا، پھر جوتیاں اتاریں اور بیڈ پر ڈھیر ہوگئی۔ اپنے بیٹوں اور بہوؤں وغیرہ کے آنے کی خوشی میں میں کل سے سو نہیں پارہی تھی اور میری اگر نیند پوری نہ ہو تو میرا دماغ سنسناتا رہتا ہے۔

برابر کے کمرے میں موجود ہماری پرانی ملازمہ ننی کو اندازہ ہوگیا کہ میں بیڈ پر آلیٹی ہوں۔ وہ وہیں سے بہ آواز بلند بولی ''شب بخیر...... آپ اب سونے کی کوشش کریں۔''

ننی پچاس سال سے ہمارے ساتھ ہے۔ پہلے وہ میرے دونوں بیٹوں کی گورنس تھی۔ جب وہ بڑے ہوگئے تو ننی میری دیکھ بھال اور خدمت پر مامور ہوگئی۔ اب جب بھی میرے بیٹے اپنے بچوں کے ساتھ آتے ہیں تو ننی اسی جوش وخروش اور محبت سے ان ننھے شیطانوں کو سنبھالتی ہے جس طرح ان کے باپوں کو سنبھالتی تھی۔ کبھی کبھی میں اس کی قوت برداشت اور تحمل مزاجی پر حیران ہوتی ہوں۔

(جاری ہے)

میرے والد کو دنیا میں میری آمد کی ذرا بھی خوشی نہیں تھی

تمکین تبسم

قسط :02

"ہاں......بس، میں سونے ہی لگی ہوں۔ میری آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی ہیں۔" میں نے نینی کو تسلی دینے کے لیے بآواز بلند کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ نیند اس وقت بھی میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور میں بیڈ پر لیٹی مسلسل چھت کو تک رہی تھی۔

میں سوچ رہی تھی کہ میرے پوتے پوتیوں کو میری بنائی ہوئی خاص اطالوی پیسٹری پسند آئے گی یا نہیں؟ اٹلی کے شہر نیپلز کے قریب واقع قصبہ "پزولی" جہاں میں نے جنم لیا اور جہاں میں بڑی ہوئی، وہاں میری ایک کزن یہ پیسٹری بہت اچھی بنایا کرتی تھی۔ شاید ایک بات یہ بھی ہے کہ بچپن میں دیکھی ہوئی صورتیں، کھائے ہوئے کھانوں کے ذائقے اور محسوس کی ہوئی خوشبوئیں انسان کو زندگی بھر یاد رہتی ہیں۔ بچپن چاہے جیسا بھی ہو، نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے، یاد رکھنے کے لیے اس میں بے شمار خوبصورت چیزیں ہوتی ہیں۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے بچپن کی یادیں مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں، بے چین کر رہی تھیں۔ اس بے چینی نے مجھے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ میں بیڈ روم سے باہر آئی اور ہال سے گزر کر اسٹڈی میں جا پہنچی۔ وہاں میں بے خیالی کے سے عالم میں، شیلفوں میں موجود کتابوں اور دوسری کئی چیزوں کو ادھر اُدھر کرنے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے لاشعوری طور پر میں کوئی چیز تلاش کر رہی ہوں۔ پھر مجھے ایک شیلف میں، پچھلی طرف آبنوسی رنگ کی لکڑی کا ایک صندوقچہ سا رکھا دکھائی دیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی ایک لمحہ کے لیے گویا میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔

میں نے جلدی سے اس صندوقچے کو شیلف سے اتار کر کھول لیا۔ اس میں کچھ خطوط تھے، تصویریں تھیں، ٹیلی گرام تھے اور مختصر سے رقعے تھے۔ یہ سب بہت پرانی اور بظاہر معمولی سی چیزیں تھیں۔ لیکن شاید انہی کی کشش مجھے کھینچ کر یہاں لا رہی تھی۔ ان چھوٹی چھوٹی، بے جان چیزوں میں بڑی طاقت تھی۔ یہ ماضی کی طاقت تھی، یادوں کی طاقت تھی۔ اس صندوقچے کو کھولتے ہی مجھ پر گویا ماضی کے دروازے کھل گئے تھے۔ اَن گنت یادیں ہر طرف سے جھانکنے لگی تھیں۔ پھر ان سب یادوں نے میرے ذہن پر یلغار کر دی۔

میں ان یادوں میں الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ یادوں میں الجھنے کے لیے بھی شاید بہت سی طاقت درکار ہوتی ہے اور مجھ میں وہ طاقت نہیں رہی تھی۔ بہت وقت گزر چکا تھا۔ بہت سے ماہ و سال بیت چکے تھے۔ میں زندگی کے سمندر میں ان مقامات سے بہت آگے نکل آئی تھی جہاں جذبات کا مد و جزر شدید ہوتا ہے، جہاں محسوسات کی اتھل پتھل طوفانی ہوتی ہے۔ میں نے سوچا کہ اس صندوقچے کو جوں کا توں ہی رکھا رہنے دوں لیکن پھر نہ جانے کس طاقت نے مجھے مجبور کر دیا کہ آہستگی سے اس کو اٹھا لوں۔

صندوقچے کو اٹھائے میں اپنے بیڈ روم میں لوٹ آئی اور اسے اپنے بیڈ پر سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس میں موجود چیزوں کو دھیرے دھیرے اٹھا کر دیکھنا شروع کیا......اور پھر جیسے کوئی انجانی طاقت مجھے دھکیلتی ہوئی، ماضی کی وادیوں میں لے گئی جہاں بھولی بسری یادیں قطار در قطار کھڑی تھیں......اور گویا میری ہی منتظر تھیں۔

ماضی کی یہ یادیں گویا میرے لیے کرسمس کا تحفہ تھیں۔ میں نے صندوقچے میں سے ڈاک کا ایک پرانا لفافہ نکالا جو کھلا ہوا تھا۔ اس پر میری بچکانہ رائٹنگ میں "دادی صوفیہ" لکھا ہوا تھا۔ میری دادی کا نام صوفیہ تھا۔ انہی کے نام پر میرا نام صوفیہ رکھا گیا تھا۔ اپنی بچکانہ رائٹنگ میں ان کا نام دیکھ کر میرے ذہن میں اپنی بچپن کی تصویر ابھر آئی۔ میں بچپن میں خاصی سوکھی سڑی ہوا کرتی تھی۔ میری آنکھیں زردی مائل تھیں اور سوکھے ہوئے چہرے پر میرے ہونٹ کافی بڑے دکھائی دیتے تھے۔ میرے چہرے پر ہمیشہ کچھ ایسا تاثر رہتا تھا جیسے میں کسی انجانی بات پر حیران ہو رہی ہوں۔

اس لفافے میں دادی کے نام لکھا ہوا میرا وہ خط موجود تھا جس میں، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا تھا۔ قصہ کچھ یوں تھا کہ میں نے اپنی دادی کو خط لکھ کر ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے بیٹے، یعنی میرے والد سے کہیں کہ وہ مجھے کچھ رقم بھیج دیں۔ ان کے کہنے پر میرے والد نے مجھے تین سو لیرے کی رقم بھیج دی تھی۔ اس بات پر میں نے دادی کا شکریہ ادا کیا تھا۔ دراصل میرے والد ہمارے ساتھ نہیں رہتے تھے۔ "ہمارے" سے مراد، میں، میری والدہ اور میری چھوٹی بہن ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میرے والد نے کبھی ہم تینوں میں سے کسی کے نام خط بھی نہیں لکھا تھا۔ وہ ہم سے بہت دور، ایک دوسرے شہر میں رہتے تھے۔

میں نے اپنی دادی کو بھی زندگی میں صرف ایک بار دیکھا تھا اور ان کے بارے میں میرا تاثر یہی تھا کہ وہ ایک سرد مہر اور کسی سے بے تکلف نہ ہونے والی خاتون تھیں۔ اس کے باوجود میں نے انہیں یہ لمبا چوڑا خط لکھ ڈالا تھا۔ اس خط میں، میں نے انہیں بتایا تھا کہ کس طرح چند دن پہلے ایک مذہبی تقریب میں مجھے باقاعدہ کرسچین تسلیم کیا گیا۔ ہمارے ہاں ہر مرد اور عورت کی زندگی میں اس کے لیے ایک ایسی تقریب ضرور منعقد ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہی درحقیقت کسی کو باقاعدہ طور پر معاشرے کا ایک فرد تسلیم کیا جاتا ہے ورنہ اس سے پہلے گویا اس کا وجود اور عدم وجود، دونوں برابر ہوتے ہیں۔

اس موقعے پر کوئی مرد یا عورت رسمی طور پر بچے یا بچی کی سرپرست بھی بنتی ہے۔ ایسے مرد کو "گاڈ فادر" اور عورت کو "گاڈ مدر" کہا جاتا ہے۔ میں نے اپنی دادی کو نہایت مسرت بھرے انداز میں اپنے خط میں یہ بھی بتایا تھا کہ میری گاڈ مدر نے اس تقریب میں مجھے سونے کا ایک کنگن تحفے کے طور پر دیا تھا۔ جس روز یہ تقریب منعقد ہوئی، میں نے اسے اپنی زندگی کا خوبصورت ترین دن قرار دیا تھا اور مسرت بھرے الفاظ کے اسی بہاؤ میں انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ میں کلاس میں سب سے زیادہ نمبروں کے ساتھ امتحان پاس کر کے پانچویں گریڈ میں چلی گئی ہوں۔

زیادہ تر بچے اپنے دادا دادی اور نانا نانی کے نام خطوں میں ایسی ہی باتیں لکھتے ہیں اور اپنی معصوم سی خوشیوں کا اظہار اور بچکانہ کامیابیوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو ان کی اپنی نظر میں بہت بڑی اور بہت اہم ہوتی ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ ان کے دادا دادی یا نانا نانی بھی یہ باتیں پڑھ کر بہت خوش ہوں گے۔ میں نے بھی لاشعوری طور پر شاید یہی محسوس کرتے ہوئے اپنی دادی کو یہ سب کچھ لکھا تھا [illegible]

دلچسپی نہیں رہی ہوگی۔ انہیں تو میری ذات سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے انہیں یہ بھی لکھ ڈالا تھا کہ وہ میری طرف سے میرے والد کا شکریہ ضرور ادا کریں کہ انہوں نے میرا اتنا خیال کیا۔ یہ خط بعد میں کسی طرح میرے پاس ہی واپس پہنچ گیا تھا۔

مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں، شاید یہ خط لکھنے پر مجھے میری نانی نے اکسایا تھا جنہیں ہم دونوں بہنیں "ما مالوئیسا" کہتی تھیں۔ ما مالوئیسا ایک نہایت ہی مہذب، شائستہ اور نرم خو خاتون تھیں جو بُرے سے بُرے حالات میں بھی وضعداری اور شائستگی کے تقاضے اور معاشرتی آداب نہیں بھولتی تھیں۔ وہ واقعی مجھ سے محبت کرتی تھیں اور انہوں نے اس وقت مجھے اپنے گھر میں بہ خوشی رکھا تھا جب میں صرف چند ماہ کی تھی۔ ان کی محبت میں بے حد سادگی، گرمجوشی اور بے غرضی تھی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ متذکرہ بالا خط لکھنے کے لیے میری والدہ نے میری ہمت افزائی کی ہو کیونکہ وہ میرے والد سے رابطہ کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈتی رہتی تھیں۔ رابطے کی کوششیں وہ اس امید پر کرتی تھیں کہ شاید میرے والد کسی طرح ان کے پاس آ جائیں۔ وہ بے چاری انہیں حاصل کرنے کے طریقے سوچتی رہتی تھیں۔ اس میں بے چاری میری والدہ کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ وہ اس وقت بالکل نوجوان ہی تو تھیں جب امید سے ہو گئی تھیں اور پھر میں دنیا میں آ گئی تھی لیکن ان کے وہ ارمان پورے نہیں ہو سکے تھے جو ہر نوجوان لڑکی کے دل میں ہوتے ہیں۔ ان کے ان خوابوں کو تعبیریں نہیں مل سکی تھیں جو اکثر جوان لڑکیاں دیکھا کرتی ہیں۔ بس، ان کی نوجوانی چُرالی گئی تھی۔ میں اپنے نانا نانی کو ہی ماما اور پاپا کہا کرتی تھی۔ والدہ کو میں چھوٹی ماما کہتی تھی۔

میری والدہ کا نام رومیلڈا ولانی تھا۔ وہ جوانی میں بے حد خوبصورت اور پُرکشش تھیں۔ اسکول میں وہ پڑھائی کے معاملے میں آگے نہیں تھیں اور انہیں تعلیم کی کوئی خاص پروا بھی نہیں تھی لیکن ان میں تخلیقی صلاحیتیں موجود تھیں۔ پیانو وہ بہت اچھا بجاتی تھیں۔ موسیقی میں انہوں نے اسکالرشپ بھی حاصل کر لی تھی جس کی وجہ سے انہیں قریبی شہر نیپلز کے ایک اچھے اسکول میں موسیقی کے شعبے میں داخلہ مل گیا تھا۔ جہاں سے انہوں نے امتیازی نمبروں کے ساتھ موسیقی کے مضمون میں گریجویشن کیا تھا۔ میرے نانا نانی کے مالی حالات بہت زیادہ اچھے نہیں تھے لیکن میری والدہ...... جو ابھی میری والدہ نہیں بنی تھیں...... ان کے شوق کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ایک پیانو خرید کر گھر کے چھوٹے سے لاؤنج میں رکھا ہوا تھا مگر میری والدہ کو مطمئن کرنے کے لیے یہ سب کچھ کافی نہیں تھا۔ ان کے اندر ایک عجیب سا اضطراب اور نہ جانے کیا کچھ کرنے کی لگن اور جوش بھرا ہوا تھا۔ ان کی آنکھیں نہ جانے کیسے کیسے خواب دیکھتی تھیں۔

ان کے خواب اس وقت دوسروں کے سامنے آئے جب مشہور امریکی فلم اسٹوڈیو "ایم جی ایم" نے اٹلی میں لڑکیوں کے درمیان ایک مقابلہ منعقد کرایا۔ ایم جی ایم والے دراصل پورے اٹلی میں کوئی ایسی لڑکی ڈھونڈتے پھر رہے تھے جس کی شکل گریٹا گاربو سے ملتی ہو، جو اس وقت ہولی وڈ کی سب سے حسین اور سب سے بڑی اداکارہ سمجھی جاتی تھیں۔ ہولی وڈ کی تمام فلمی ہیروئنوں میں ان کی حیثیت ملکہ کی سی تھی۔ ایم جی ایم والے کسی فلم کے لیے، کہانی کی مطابقت سے کوئی ایسی لڑکی ڈھونڈ رہے تھے جس کی شکل، فلم کی ہیروئن گریٹا گاربو کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ملتی ہو۔

میری والدہ اپنے والدین، یعنی میرے نانا نانی کو بتائے بغیر اس مقابلے میں شرکت کے لیے جا پہنچیں اور انہوں نے مقابلے کے لیے اپنے آپ کو جیوری کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ اس اعتماد کے ساتھ گئی تھیں کہ مقابلہ وہی جیتیں گی......اور ایسا ہی ہوا۔ انہیں مقابلہ جیتنے میں ذرا بھی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ بالکل افسانوی انداز میں مقابلہ جیت گئیں۔ وہ اس وقت صرف سترہ سال کی تھیں۔ ایم جی ایم والوں نے انہیں فوراً ہی ہولی وڈ کا ہوائی ٹکٹ دے دیا تاکہ وہ وہاں آ کر اسکرین ٹیسٹ دے سکیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ ہولی وڈ کا ٹکٹ ہاتھ میں لے کر کیسی خوش خوش گھر آئی ہوں گی......لیکن گھر پہنچ کر ان کی ساری خوشی دھری رہ گئی۔

نانا نانی نے ساری بات سن کر انہیں صاف منع کر دیا کہ وہ امریکا نہیں جا سکتیں۔ ان کے خیال میں امریکا شاید دنیا کے دوسرے سرے پر کہیں واقع تھا۔ وہ اپنی نوجوان بیٹی کو ایسے کسی اجنبی اور دور افتادہ ملک میں تنہا بھیجنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میری والدہ...... یا یوں کہیے کہ نوجوان رومیلڈا نے اپنے والدین کو قائل کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ میرے نانا، جنہیں میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے "پاپا ڈومینگو" کے نام سے، اور میری نانی جنہیں میں نے "ما مالوئیسا" کے نام سے جانا، وہ دونوں قدامت پسند اور روایت پرست تھے۔ رومیلڈا کے اصرار کے جواب میں ان دونوں کے سر مستقل طور پر نفی میں ہلتے رہے۔

سنا ہے کہ ایم جی ایم والے، جو اس اطمینان کے ساتھ رخصت ہو گئے تھے کہ انہوں نے اپنی مطلوبہ لڑکی تلاش کر لی ہے، جب رومیلڈا اپنے وعدے کے مطابق ان کے پاس نہیں پہنچی تو وہ دوبارہ طویل سفر کر کے اٹلی آئے۔ انہوں نے میرے نانا نانی کو منانے کی کوشش کی کہ وہ اپنی بیٹی کو امریکا بھیج دیں، اس کا کچھ نہیں بگڑے گا، اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، وہاں ایک شاندار مستقبل اس کا منتظر ہے......لیکن میرے نانا نانی کو ایسی باتوں کا قائل نہیں ہونا تھا، وہ نہیں ہوئے۔ آخرکار ایم جی ایم والوں نے اس لڑکی کو منتخب کر لیا جو دوسرے نمبر پر آئی تھی۔

رومیلڈا کو اس بات کا بڑا صدمہ تھا کہ اس کے والدین نے اسے اپنے خوابوں کی تعبیریں پانے کے لیے ہولی وڈ جانے نہیں دیا تھا۔ اس کے دل میں والدین کے خلاف ایک قسم کی رنجش سی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد جونہی اسے موقع ملا، وہ ان سے پوچھے بغیر ہی گھر سے روانہ ہو گئی۔ وہ ہولی وڈ تو نہیں جا سکی لیکن اٹلی کے دارالحکومت روم ضرور چلی گئی جہاں "سینما سٹی" کے نام سے اسٹوڈیوز اور فلمی دفاتر وغیرہ پر مشتمل ایک بہت بڑا علاقہ موجود تھا۔ اسے آپ اٹلی کا ہولی وڈ کہہ سکتے ہیں۔ اطالوی میں اس کا نام "سنے سیتا" تھا۔ رومیلڈا نے غالباً یہی سوچا تھا کہ اگر وہ قسمت آزمائی کے لیے بہت دور، ایک اجنبی ملک میں نہیں جا سکی تو کم از کم اپنے ملک میں تو اپنے خوابوں کی تعبیریں ڈھونڈنے کی کوشش کر سکتی ہے۔ (جاری ہے)

صوفیہ لورین کی داستانِ حیات

میں بچپن میں بے حد شرمیلی ہوا کرتی تھی

تمکین تبسم

قسط :03

پزولی نامی قصبے کی اس نوخیز ''گریٹا گاربو'' کو معلوم نہیں تھا کہ نوجوان اور ناتجربہ کار لڑکیاں جب اجنبی راستوں پر سفر کرنے کے لیے گھر سے قدم نکالتی ہیں تو راستے میں ہزاروں دھوکے، ہزاروں فریب ان کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی دھوکے، کسی فریب نے تو محبت کا لبادہ بھی اوڑھ رکھا ہوتا ہے۔ 1933ء کے موسم خزاں کی ایک شام کے دوران ایسا ہی ایک دھوکا، ایک وجیہہ اور خوبرو نوجوان کے روپ میں رومیلڈا کو روم کی ایک گلی میں ملا۔ اس نوجوان کا نام رکارڈو سیکولون تھا۔ وہ صرف دراز قد، خوبرو اور وجیہہ ہی نہیں تھا بلکہ اسے اپنی گفتگو اور طور طریقوں سے لڑکیوں کو شیشے میں اتارنے کا فن بھی خوب آتا تھا۔

اسے جونہی پتا چلا کہ جس خوبصورت اور انتہائی پُرکشش لڑکی سے وہ متعارف ہوا ہے، وہ ایک چھوٹے سے قصبے سے آئی ہے، بڑے شہروں کی زندگی اور دنیا کے معاملات کا اسے کوئی تجربہ نہیں لیکن وہ شوبزنس کی دنیا میں کوئی مقام حاصل کرنے کا خواب آنکھوں میں لے کر گھر سے نکلی ہے، تو بس...... اس کا تو جیسے کام ہی آسان ہوگیا۔ اس نے رومیلڈا کو بتایا کہ وہ فلموں میں کام کرتا ہے حالانکہ اس کا فلموں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ فلموں میں کام کرنا تو درکنار، اس نے شاید کبھی کسی اسٹوڈیو کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔

اس وقت تک نوجوان اور نادان رومیلڈا ''سینما سٹی'' کے اسٹوڈیوز میں کافی دھکے کھا چکی تھی اور اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہاں ایکسٹرا کے طور پر بھی کام حاصل کرنے کے لیے لڑکیوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوتی تھیں۔ اسے ہولی وڈ والے دوسری گریٹا گاربو بنانے کے لیے اس کے گھر سے لینے آئے تھے لیکن اس وقت وہ ان کے ساتھ نہیں جا سکی تھی اور اب اس کے لیے اپنے ہی ملک میں کسی اسٹوڈیو میں داخل ہونا بھی دشوار تھا۔ ان حالات میں جب اس کی ملاقات خوابوں کے شہزادے جیسے ایک نوجوان سے ہوئی، جس کا کہنا تھا کہ وہ نہ صرف خود فلموں میں کام کرتا تھا بلکہ اسے بھی نہایت آسانی سے کام دلوا سکتا تھا، تو اسے اپنے خوابوں کی تعبیریں اپنی رسائی میں نظر آنے لگیں۔

رکارڈو اس وقت بیس سال کا تھا۔ وہ ذرا خوشحال تھا اور اس کا تعلق ایک معزز خاندان سے تھا۔ اس نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن کوئی اچھی ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے فی الحال عارضی طور پر ریلوے میں نوکری کر رہا تھا۔ بہت جلد رکارڈو نے رومیلڈا کو شہر کے وسط میں واقع ایک اچھے ہوٹل کے کمرے میں، تنہائی میں ملاقات کے لیے آمادہ کرلیا۔ اس ملاقات میں اور کچھ ہوا یا نہیں، لیکن نوجوانی نے اپنے ارمان خوب نکالے۔

معاملات شاید اس سے آگے بھی کافی عرصے تک خوشگوار انداز میں چلتے رہتے لیکن پھر ہوا یہ کہ میں بیچ میں آگئی اور سب کچھ تہس نہس ہوگیا۔ یعنی، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجیے کہ رومیلڈا امید سے ہوگئی اور یہ خبر سن کر رکارڈو پریشان ہوگیا۔ اس بارے میں تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اولاد...... اور وہ بھی اس کم عمری میں...... وہ بھی بغیر شادی کے......؟ یہ تو بہت ٹیڑھا معاملہ تھا۔ ہونے والے بچے یا بچی سے تو اسے کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں لیکن اس کی آمد کے آثار دیکھ کر اب اسے رومیلڈا سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی اور وہ اس سے بھی جان چھڑانے کی فکر میں رہنے لگا۔

ماما لوئیسا، یعنی میری نانی کو علم ہوگیا کہ ان کی بیٹی ایک پریشان کن صورت حال سے دوچار ہے۔ وہ فوراً روم پہنچیں۔ اپنی بیٹی کے علاوہ انہوں نے رکارڈو سے بھی ملاقات کی اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ رومیلڈا سے شادی کرے۔ ان کے دباؤ سے وہ کافی حد تک آمادہ بھی دکھائی دینے لگا تھا کہ وہ رومیلڈا سے شادی کرلے گا لیکن پھر نہ جانے کیوں وہ بدک گیا۔ اس نے لنگڑے بہانے بنانے شروع کردیے اور بہت سارے مسئلے مسائل گنوانے لگا۔ قصہ مختصر یہ کہ شادی کی نوبت نہیں آسکی۔ تاہم میرے والد نے اتنی مہربانی ضرور کی کہ اپنے معزز اور ایک قسم کے شاہی خاندان کا نام، اپنے ہونے والے بچے یا بچی کے نام کے ساتھ لگانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ اب صورت حال یہ ہے کہ میں گو کہ اپنے باپ کی جائز اولاد نہیں ہوں لیکن میں چاہوں تو ان کا نہایت معززانہ خاندانی نام 'سیکولون' اپنے نام کے ساتھ لگا سکتی ہوں...... لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔

میں 20 ستمبر 1934ء کو روم کے سانتا مارگریٹا اسپتال کے اس وارڈ میں پیدا ہوئی جہاں بغیر شادی کے ماں بننے والی عورتوں کو داخل کیا جاتا تھا۔ میں شاید اپنے ساتھ تھوڑی سی ذہانت اور بہت سی غربت لے کر پیدا ہوئی تھی۔ میری والدہ نے میرا نام دادی کے نام پر 'صوفیہ' رکھ کر شاید ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ خوشنودی انہیں کبھی حاصل نہیں ہوسکی۔ دادی نے اپنے گھر کے دروازے بھی ہمارے لیے نہیں کھولے اور رکارڈو، یعنی پاپا بھی ہمیں وہاں لے جانے میں ناکام رہے البتہ انہوں نے ہم ماں بیٹی پر اتنا کرم کیا کہ ہمارے لیے ایک ہوسٹل میں کمرہ لے لیا جہاں وہ کچھ دن خود بھی ہمارے ساتھ رہے۔ میرا خیال ہے صرف ان تھوڑے سے دنوں کے لیے ہم کسی حد تک ایک فیملی، ایک کنبہ نظر آئے ہوں گے۔

ہم اس کمرے میں رہ تو رہے تھے لیکن ہمارے پاس گزر اوقات کے لیے پیسے نہیں تھے۔ وہ کمرا بھی نہایت غیر آرام دہ تھا۔ اس کی کوئی بھی چیز ٹھیک نہیں تھی۔ پاپا کی جیب خالی تھی کیونکہ وہ بے روزگار ہو چکے تھے۔ چھوٹی موٹی نوکری وہ کرتے نہیں تھے، ان کے نخرے بہت تھے، جیسی ملازمت وہ چاہتے تھے، اس کے لیے ان کے پاس مطلوبہ تعلیمی قابلیت اور تجربہ نہیں تھا۔ میری والدہ کو کھانا میسر نہیں تھا جس کی وجہ سے ان کے دودھ نہیں اترتا تھا جو وہ مجھے پلا سکتیں۔ میں روز بروز کمزور ہونے لگی۔

آخرکار ایک روز میری والدہ مجھے مکان مالکن کے سپرد کرکے ملازمت کی تلاش میں نکلیں۔ مکان مالکن کو بچے پالنے یا رکھنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں ابھی صرف دودھ پینے کی عمر میں تھی لیکن اس نے مجھے بھوک سے روتے دیکھ کر مسور کی دال کا ایک چمچ پلا دیا جس سے میں مرتے مرتے بچی۔ اس دوران پاپا ایک بار پھر غائب ہو چکے تھے۔ ان حالات میں میری ماما کے سامنے غالباً ایک ہی راستہ تھا اور انہوں نے وہی اختیار کیا۔ انہوں نے کسی طرح پزولی کا ٹکٹ خریدا اور مجھے ساتھ لے کر اپنے گھر روانہ ہوگئیں۔

اُس وقت ان کی ظاہری ہی نہیں، باطنی حالت بھی یقیناً بہت خراب ہوگی۔ ان کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ شوہر ان کے ساتھ نہیں تھا مگر ان کی گود میں ایک شیرخوار بچی تھی جو جاں بہ لب تھی، مرنے کے قریب تھی۔ انہیں بے پناہ ندامت کا احساس بھی تھا کہ انہوں نے ماں باپ کی عزت مٹی میں ملائی تھی۔ میں اندازہ کرسکتی ہوں کہ اُس وقت وہ کیسی درماندہ اور دل شکستہ ہوں گی۔ انہیں یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ ان کی فیملی انہیں قبول کرے گی یا نہیں؟ والدین انہیں اپنے گھر میں داخل ہونے دیں گے یا نہیں؟

وہ کم از کم اس حد تک خوش قسمت تھیں کہ ان کے اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ میری نانی 'ماما لوئیسا' نے جونہی گھر کا دروازہ کھولا اور ان کی نظر اپنی شکست خوردہ بیٹی کے مضمحل اور ندامت زدہ چہرے پر پڑی، پھر انہوں نے بیٹی کے بازوؤں پر ایک شیرخوار، نیم جاں بچی کو دیکھا تو دونوں بازو پھیلا کر یوں بے تابی سے ان دونوں کو اپنے سینے سے لگا لیا جیسے وہ انہی کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے ہمیں اندر لا کر پہلے مما کو کچھ کھلایا پلایا اور پھر میری حالت بہتر بنانے کی کوششیں شروع کردیں۔ درحقیقت سبھی گھر والوں نے ہم ماں بیٹی کو سنبھال لیا۔

زارا نامی ایک خاتون کو بلایا گیا جو نہایت اچھی صحت کی مالک تھی اور اپنا دودھ پلا کر بچوں کو پالنے کے لیے مشہور تھی۔ اسے تنخواہ دینے کے لیے گھر والوں نے اپنے کھانے پینے اور دیگر اخراجات میں کمی کردی۔ اپنا پیٹ کاٹ کر انہوں نے ہماری بہتر نگہداشت کے انتظامات کیے۔ اس دوران صرف نانا نانی ہی نہیں، میرے دونوں ماموں اور میری خالہ بھی ہمارے ساتھ نہایت شفقت اور مہربانی کا سلوک کر رہے تھے۔ مما کے اندیشوں کے برعکس، اس وقت میری اور مما کی مدد کے لیے سارا کنبہ ہی متحد ہوگیا۔ کسی نے ہمیں نہیں دھتکارا، کسی نے لعن طعن نہیں کی اور کسی نے ہماری طرف سے منہ نہیں پھیرا۔ پوری فیملی نے ہمیں پناہ میں لے لیا۔

میرے ننھیال کے مالی حالات قطعی اچھے نہیں تھے۔ لیکن میری اور مما کی مدد کرنے کے لیے وہ پوری کشادہ دلی سے تیار نظر آتے تھے۔ اپنے گھر کے اس پُرخلوص اور محبت بھرے ماحول میں واپس پہنچ کر یقیناً مما کی جان میں جان آئی ہوگی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ صرف زارا کے صحت بخش دودھ سے میری صحت بہتر نہیں ہو رہی تھی کیونکہ مجھے بڑی خوفناک قسم کی کھانسی بھی چمٹ چکی تھی۔ ڈاکٹر نے میرا معائنہ کرنے کے بعد مشورہ دے دیا کہ مجھے کسی پہاڑی مقام پر لے جایا جائے، وہاں کی صحت افزا آب و ہوا میں میری، اس کھانسی سے جان چھوٹ سکتی تھی۔

میرے نانا نانی نے اس موقع پر بھی میرے لیے قربانی دی اور اپنا چھوٹا سا اپارٹمنٹ چھوڑ کر قریب ہی ایک ایسی بستی میں چلے گئے جو پہاڑی کی بلندی پر واقع تھی۔ ڈاکٹر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہاں پہنچ کر میری کھانسی کم ہونے لگی۔ میرے ذرا بڑے ہونے پر جب نانا نانی نے اس زمانے کی باتیں مجھے بتائیں تو ان سے مجھے پتا چلا کہ ایک روز وہ مجھے گود میں لے کر چہل قدمی کے لیے نکلے تو پہلی بار میرے زرد چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی جسے دیکھ کر میری نانی نے خوشی اور طمانیت سے کہا ''اب یہ بچی بچ جائے گی۔ اب اس کی زندگی خطرے سے نکل آئی ہے۔''

اس کا مطلب ہے کہ اس سے پہلے انہیں میرے بارے میں اندیشہ تھا کہ شاید میں زندہ نہ بچ سکوں۔ جب میری صحت قدرے بہتر ہوگئی تو میرے نانا نانی اپنے اپارٹمنٹ میں واپس آگئے۔ میرے نانا چھوٹے قد کے ایک فربہی مائل آدمی تھے۔ وہ گولہ بارود تیار کرنے والی ایک فیکٹری میں کسی شعبے کے انچارج تھے۔ چند برس بعد جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس فیکٹری کی وجہ سے ہمارا قصبہ پزولی، اتحادی فوج کی مسلسل اور خوفناک بمباری کا نشانہ بنا۔ میرے نانا کی عمر کافی تھی لیکن وہ بہت محنت کرتے تھے۔ فیکٹری میں ان کا کام کافی مشقت طلب تھا۔ وہ شام کو گھر آتے تو ان کی خواہش بس یہ ہوتی تھی کہ آرام کریں اور اخبار پڑھیں لیکن گھر میں سات افراد تھے اور ہمارے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں شاذ و نادر ہی ایسا ماحول ہوتا تھا کہ کوئی سکون سے بیٹھ سکتا اور اخبار پڑھ سکتا۔ میرے دونوں ماموں اکثر بے روزگار رہتے تھے۔ میری خالہ ایک چھوٹے سے دفتر میں ٹائپسٹ تھیں۔ کمانے والے سب افراد کی آمدنی، ملا کر بھی گھر کے اخراجات کے لیے ناکافی تھی۔ کبھی کبھی ہمارے ہاں ناشتے کے لیے میز پر ڈبل روٹی بھی موجود نہیں ہوتی تھی۔

میری نانی، ماما لوئیسا گھر کا نظام اچھے طریقے سے چلانے اور ماحول کو پُرسکون رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھیں۔ ان کی شخصیت ایک گھنے سایہ دار درخت کی طرح تھی جو ہمیں وقت، حالات اور موسم کی سختیوں سے محفوظ رکھتی تھی، تنگدستی کا احساس نہیں ہونے دیتی تھی۔ شاید یہ ان کی شخصیت کی مضبوطی تھی جس کی وجہ سے ہمیں وہ چھوٹا سا اپارٹمنٹ ایک مضبوط قلعے کی طرح تحفظ کا احساس دیتا تھا۔ وہاں چھوٹے سے کچن میں پکتے ہوئے معمولی اور غریبانہ کھانوں کی خوشبوئیں بھی مجھے بہت اچھی محسوس ہوا کرتی تھیں۔ آج بھی وہ زمانہ اور وہ خوشبوئیں یاد آتی ہیں تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

کبھی کبھار کے ناغوں کے ساتھ، ہمیں جو غریبانہ کھانے میسر آتے تھے، دوسری عالمگیر جنگ کے دوران وہ بھی خواب و خیال ہوگئے۔ ہر چیز کا ایسا قحط پڑا اور کھانے پینے کی چیزیں تو خاص طور پر ایسی نایاب ہوئیں کہ ہمیں زندگی کے وہ دن بھی شاہانہ محسوس ہونے لگے جب ہمیں غریبانہ اور ناکافی ہی سہی لیکن کھانے میسر تو ہوا کرتے تھے۔

اس زمانے میں، یعنی دوسری عالمگیر جنگ شروع ہونے سے پہلے میری والدہ چار پیسے کمانے کے لیے کبھی کبھار پزولی اور نیپلز کے کسی کیفے، ہوٹل یا کسی تفریح گاہ میں گانا گانے چلی جاتیں تاکہ گھر کے اخراجات میں ہاتھ بٹا سکیں۔ کبھی کبھی وہ میرے پاپا، رکارڈو کے پاس روم بھی چلی جاتیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز وہ باہر سے آئیں تو گویا کسی انجانے خوف سے تھرتھر کانپ رہی تھیں۔ اسی عالم میں انہوں نے ماما لوئیسا کو بتایا کہ وہ ایک بار پھر امید سے تھیں۔ نانی سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ اس روز انہوں نے بیٹی کے سامنے پوری طرح شکست تسلیم کرلی۔ انہیں یقین ہوگیا کہ یہ لڑکی اپنی مرضی کے راستے پر ہی چلے گی اور اسے کبھی اپنے بُرے بھلے کی تمیز نہیں ہوسکے گی۔

وقت پورا ہونے پر میری چھوٹی بہن ماریا دنیا میں آگئی۔ اس بار تو پاپا نے اس کے نام کے ساتھ اپنا خاندانی نام لگانے کی بھی اجازت نہیں دی اور ہمارے ننھیال کا خاندانی نام 'ولانی' اس کے نام کے ساتھ لگایا گیا۔ ماریا 1938ء میں پیدا ہوئی۔ میں نے اپنے پاپا، رکارڈو کو پہلی بار اس وقت دیکھا جب میں پانچ سال کی تھی۔ مما نے انہیں ٹیلیگرام بھیج کر، اس بہانے سے بلایا تھا کہ ان کی بیٹی، یعنی میں سخت بیمار ہوں۔ اس اطلاع پر بھی وہ فوری طور پر تو نہیں آئے لیکن بہرحال، آگئے۔

وہ میرے لیے سرخ رنگ کی ایک کھلونا کار لے کر آئے جس کے ایک دروازے پر میرا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ اس کھلونا کار کو میں نے آج بھی محفوظ رکھا ہوا ہے...... اپنے دل میں......! میں پاپا کے سامنے جا کر اتنا شرما رہی تھی کہ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی نظر نہیں اٹھائی اور ان کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا حالانکہ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ کہیں وہ میرے اس انداز پر بُرا نہ منا جائیں۔ ویسے بھی میں بچپن میں بہت شرمیلی ہوا کرتی تھی۔ بعد میں ایک بار انہوں نے مجھے پہیوں والے جوتے بھی تحفے کے طور پر دیے جنہیں پہن کر میں اپنی بلڈنگ کی، ہال نما لابی میں اسکیٹنگ کیا کرتی۔

میری چھوٹی بہن ماریا بھی اسکیٹنگ کے لیے وہ جوتے مانگتی اور ضد کرتی۔ شاید میں اس کم عمری میں لاشعوری طور پر اپنی چھوٹی بہن کے لیے اذیت پسند تھی۔ میں جان بوجھ کر اسے اس وقت جوتے دیتی جب ان کے پہیوں میں تیل دیا جا چکا ہوتا تھا۔ جب ان جوتوں کے پہیوں میں تیل دیا جاتا ہے تو یہ دو تین دن تک بہت رواں رہتے ہیں اور اسکیٹنگ کرنے والا ذرا سی کوشش سے ہی بہت تیزی سے آگے جاتا ہے۔ ماریا بے چاری کو اسکیٹنگ کی زیادہ مشق نہیں تھی۔ وہ ان رواں پہیوں کی وجہ سے اکثر گر جاتی۔

ہماری بلڈنگ کے گیٹ پر سرخ ماربل کا اتنا خوبصورت چھجا بنا ہوا تھا کہ بعد میں جب میں نے ہولی وڈ میں اسٹار بن کر وہاں بہت سے محل نما مکانات دیکھ لیے تب بھی مجھے وہ چھجا یاد آتا تو ان کے چھجوں وغیرہ سے زیادہ خوبصورت محسوس ہوتا۔ اسٹار بننے کے بعد میں اس بلڈنگ کو دیکھنے گئی تو اس چھجے کا خوبصورت رنگ مجھے دھندلا دھندلا سا لگا۔ شاید یہ گزرے ہوئے ماہ و سال کی دھندلاہٹ تھی...... یا پھر شاید میری آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔

(جاری ہے)

بھوک اپنے خوفناک پنجوں سے میرے معدے کو نوچتی

تمکین تبسم

قسط: 04

زیادہ تر لوگوں کو اپنا بچپن اچھا لگتا ہے، خواہ حالات کیسے ہی رہے ہوں۔ مجھے بھی اچھا لگتا ہے اور میرا خیال ہے کہ ہمیں جو بھی وسائل میسر تھے، ان کے اندر رہتے ہوئے میں نے ایک اچھی زندگی گزاری تاہم اس بات پر شاید آپ کو حیرت ہوئی ہو.....اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کو یقین ہی نہ آیا ہو کہ میں بچپن میں بے حد شرمیلی ہوا کرتی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ذرا سی سمجھدار ہوتے ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں ایک معیوب سی صورت حال میں پرورش پا رہی ہوں۔ میری والدہ نہایت خوبصورت، نوجوان اور زندگی سے بھرپور تھیں، ان کے بال بہت ہی سنہرے تھے، ان کی حرکات و سکنات میں ہمیشہ ایک قسم کا جوش اور ولولہ نظر آتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ غیر شادی شدہ تھیں مگر دو بچیوں کی ماں تھیں۔

سونے پر سہاگا یہ تھا کہ ہمارے والد ہمارے ساتھ نہیں رہتے تھے۔ ایک عجیب سی بات یہ تھی کہ کبھی کبھی مجھے اپنی والدہ کی غیر معمولی خوبصورتی کی وجہ سے بھی شرمندگی ہوتی تھی کیونکہ راہ چلتے مرد، مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھتے تھے۔ تب میں سوچا کرتی تھی کہ میری والدہ کوئی عام سی عورت ہی ہوتیں تو اچھا تھا، جیسی کہ زیادہ تر بچوں کی ہوا کرتی ہیں، جن کے بال سیاہ اور صورت شکل اوسط درجے کی ہوتی ہے، جو ایپرن باندھ کر کچن میں کام کرتی ہیں اور عموماً جن کی آنکھوں سے ایک بے عنوان سی تھکن جھلکتی رہتی ہے۔ والدہ کے بجائے میری نانی اس تصور پر پورا اترتی تھیں۔ مجھے اس وقت گمان بھی نہیں تھا کہ بیسیوں سال بعد میں ایک فلم ''اے اسپیشل ڈے'' (A Special Day) میں اسی قسم کی گھریلو خاتون کا رول کروں گی جس کا نام انتونیا ہوگا اور جس کے چھ بچے ہوں گے۔

میں اسکول میں اکثر دعا کیا کرتی تھی کہ میری والدہ مجھے لینے نہ آئیں۔ مجھے دوسرے بچوں کی موجودگی میں ان کے سامنے جاتے ہوئے بھی کچھ شرم سی محسوس ہوتی تھی۔ بچے اپنی ناسمجھی کے باعث...... یا ویسے بھی، عام طور پر بڑے منہ پھٹ ہوتے ہیں۔ کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کب وہ، کس کے سامنے، کیا کہہ دیں۔ والدہ سے ہٹ کر بھی، مجھے چھیڑنے کے لیے میرے کلاس فیلوز کے پاس کئی جواز موجود تھے۔ میں زیادہ گوری نہیں تھی اور بالکل سوکھی سڑی تھی۔ کلاس کی لڑکیوں نے میرا نام ''توتھ پک'' رکھا ہوا تھا۔ ہمارا اسکول ذرا مذہبی قسم کا تھا اور ایک چرچ سے منسلک تھا۔ اسے راہبائیں چلاتی تھیں۔ میں ایک ننھے فوجی کی طرح مستعدی اور صفائی ستھرائی سے اپنے سارے کام کرتی تھی لیکن اپنے کلاس فیلوز اور ٹیچرز کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتی اور شرماتی تھی۔ میں عموماً سب سے آخر میں کلاس روم میں داخل ہوتی تھی اور چپکے سے، سب سے پیچھے جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ میرا انداز کسی حد تک چوروں جیسا ہوتا تھا۔

صحیح معنوں میں میری ایک ہی دوست تھی۔ اس کا نام ایڈل تھا۔ وہ اسی بلڈنگ میں رہتی تھی جس میں ہمارا اپارٹمنٹ تھا۔ ہمارے اپارٹمنٹ بھی ایک ہی منزل پر تھے۔ صبح سیڑھیوں پر ہماری ملاقات ہوتی۔ اس کے بعد شام تک ہم ساتھ ہی رہتیں۔ ایڈل پرائمری کے بعد ہمارے اسکول الگ ہو گئے۔ وہ اس اسکول میں چلی گئی جہاں دستکاری وغیرہ سکھائی جاتی تھی اور مجھے ایک ایسے اسکول میں داخل کرا دیا گیا جہاں پڑھنے والے آگے چل کر عموماً ٹیچر بنتے تھے۔ اسکول الگ ہونے کے بعد بھی بہرحال ہم چھٹی ہوتے ہی یکجا ہو جاتیں۔ ایڈل اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ گویا میرے بچپن کے بہت سے محسوسات اپنے ساتھ ہی لے گئی۔

ایڈل کے گھرانے کے مالی حالات ہم سے ذرا بہتر تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کا گھرانا ہم سے چھوٹا تھا۔ اس کے گھر میں، کھانے والے افراد ہم سے کم تھے۔ ایڈل کو اس کی سالگرہ پر اچھی سی ایک گڑیا تحفے میں ملتی، جسے لے کر وہ فوراً میرے پاس آ جاتی اور ہم دونوں مل کر اس سے کھیلتیں جبکہ میری سالگرہ پر نانی مجھے ذرا سخت قسم کا کچھ تارکول دیتیں تاکہ میں اس سے کوئی مقدس مجسمہ بنا لوں۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتیں کہ میں سارا سال اچھی بچی بن کر نہیں رہی ہوں، اس لیے مجھے اچھا تحفہ نہیں دیا جا رہا...... لیکن یہ کہتے وقت ان کی آنکھوں میں میرے لیے محبت اور شفقت ہوتی، یا پھر وہ مجھ سے نظریں چرا رہی ہوتیں۔ میں کم عمر ہونے کے باوجود ان کے اس انداز سے سمجھ جاتی کہ وہ لنگڑا بہانہ بنا رہی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میری سالگرہ پر مجھے اچھا تحفہ دینے کے لیے ہمیشہ کی طرح ان کے پاس رقم ہی نہیں ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو ہماری مفلوک الحالی اور تنگدستی میں اضافہ ہو گیا۔ بے روزگاری بڑھنے لگی اور ضروریات زندگی ناپید ہونے لگیں۔ ہمارے گھر میں فاقے بڑھ گئے۔ ایڈل کے کچن سے آنے والی، کھانوں کی خوشبوئیں اکثر میری برداشت سے باہر ہو جاتیں اور میں اس امید پر ان کے ہاں چلی جاتی کہ شاید ایڈل کی والدہ مجھے بھی کھانے میں شریک کر لیں۔ کبھی کبھار میری یہ توقع پوری ہو جاتی لیکن کبھی کبھی گویا انہیں مجھ کو کھانے کی میز پر بلانے کا خیال ہی نہیں آتا تھا اور وہ لوگ خود کھانا کھاتے ہوئے مجھ سے صرف باتیں کرتے رہتے تھے۔ شاید وہ لاشعوری طور پر سمجھتے ہوں کہ میں کھانا کھا کر آئی ہوں گی حالانکہ اس وقت بھوک سے میرے پیٹ میں بل پڑ رہے ہوتے تھے...... لیکن اپنی تمام تر کم عمری کے باوجود مجھ میں اتنی انا ضرور تھی کہ اگر وہ مجھے کھانے کے لیے مدعو نہیں کرتے تھے تو میں میز کے قریب بھی نہیں جاتی تھی۔

بہت سالوں بعد جب ایک خصوصی ٹی وی پروگرام کی ریکارڈنگ کے سلسلے میں میرا ہولی وڈ سے پزولی جانا ہوا تو میں نے ایڈل سے رابطہ کر کے اسے بھی اس پروگرام میں شریک کیا۔ اس کے بعد اس سے میرا ہمیشہ رابطہ رہا لیکن مزید کچھ برسوں کے بعد ایک دن ایسا بھی آیا جب میں نے اسے فون کیا تو اس نے فون ریسیو نہیں کیا۔ اس روز میری سالگرہ تھی اور وہ شاید میری زندگی کی سب سے غمناک سالگرہ تھی۔ مجھے پتا چلا کہ ایڈل پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور وہ وہیل چیئر پر تھی۔ وہ مجھ سے بات نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس کی آواز ہی نہیں نکلتی تھی۔ میں جو کچھ کہہ رہی تھی، وہ اس کی بیٹیوں نے اسے بتایا تو وہ چپکے چپکے روتی رہی۔ رونے کے دوران بھی اس کے منہ سے کسی قسم کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس کی بیٹیوں نے مجھے بتایا کہ آنسو خاموشی سے اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

میرا اسکول جو ایک چرچ کے زیر انتظام تھا، وہاں یتیم بچے میری سب سے زیادہ توجہ کا مرکز ہوتے تھے کیونکہ راہبائیں انہیں سب سے پیچھے بٹھاتی تھیں، اس طرح گویا انہیں ان کی یہ بدنصیبی یاد دلائی جاتی تھی کہ وہ یتیم ہیں۔ ان کے آگے مجھے بٹھایا جاتا تھا اس طرح گویا میرا مقام، یتیم اور عام بچوں کے درمیان کہیں تھا۔ یتیم خانہ ہمارے اسکول کے قریب ہی تھا، میرا وہاں جانے اور اچھی طرح اس کا جائزہ لینے کو بڑا دل چاہتا تھا۔ ہمارا اسکول سیڑھیوں کے ایک کافی طویل سلسلے کے ذریعے یتیم خانے کی عمارت سے جڑا ہوا تھا لیکن ہمیں ان سیڑھیوں کی طرف جانے کی اجازت نہیں تھی۔

راہبائیں کافی سخت مزاج تھیں۔ میں ان سے بہت ڈرتی تھی حالانکہ میرے ساتھ انہوں نے کبھی سخت رویہ اختیار نہیں کیا تھا۔ انہیں دوسرے بچوں کو سزا دینی ہوتی تو وہ انہیں ہاتھ پھیلانے کا حکم دیتی تھیں اور ہاتھوں پر چھڑیاں مارتی تھیں لیکن میرے ہاتھ پر نہ جانے کیوں، انہوں نے کبھی چھڑی نہیں ماری۔ میں بتا چکی ہوں کہ میں بچپن ہی سے بہت شرمیلی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ، بچپن کی تمام تر معصومیت کے باوجود، میرے لاشعور میں بہت ہلکی سی بغاوت کا جذبہ بھی موجود تھا۔ میں کبھی کبھار چپکے سے ایسی جگہوں کو بھی صرف دور دور سے دیکھنے کیلئے چلی جاتی تھی جہاں جانے سے مجھے منع کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے بچپن کے بارے میں ایک بات یاد کر کے مجھے آج بھی حیرت ہوتی ہے۔ مجھے اپنی عمر کے اس معصومانہ دور میں اکثر خدا کی تلاش رہتی تھی۔ میں کبھی کبھی چرچ چلی جاتی جہاں لوگ عبادت میں مصروف ہوتے۔ میں سب سے پیچھے کھڑی ہو کر ان کے ساتھ عبادت میں شریک ہو جاتی اور دعاؤں کے دوران بڑے خشوع و خضوع سے ''آمین'' کہتی۔ میرا خیال تھا کہ شاید اس دوران کہیں اپنے رب سے میری ملاقات ہو جائے۔

جب دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی اور اس کے شعلے اٹلی تک پہنچے تو میں چھ سال کی تھی اور جب جنگ ختم ہوئی تو میں گیارہ سال کی ہو چکی تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران یادوں کے جو نقوش میرے ذہن پر ثبت ہوئے، وہ شاید کبھی نہ مٹ سکیں۔ اس جنگ کا خیال آتے ہی میرے ذہن میں بموں کے خوفناک دھماکے اور سائرن کی کریہہ آواز گونجنے لگتی ہے۔ پھر تاریکی، سردی اور اس بھوک کا احساس ہوتا ہے جو گویا اپنے نادیدہ مگر خوفناک پنجوں سے معدے کو اندر سے نوچتی تھی۔ جنگ کی وہ تاریک راتیں بہت ہی خوفناک ہوتی تھیں اور تاریکی کا کچھ ایسا خوف زندگی بھر کیلئے میرے ذہن پر بیٹھ گیا ہے کہ میں آج تک اندھیرے میں نہیں سو سکتی۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے، میں لائٹ آن رکھ کر سوتی ہوں۔

ہمارے چھوٹے سے قصبے میں سب سے پہلے جرمن فوجیوں کے دستے پہنچے تھے جو اس وقت اٹلی کے اتحادی تھے۔ یہ فوجی صبح ہمارے گھر کے سامنے سڑک پر مارچ کرتے۔ سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والے ان دراز قد فوجیوں کو میں اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے دیکھا کرتی۔ دل میں کچھ خوف بھی ہوتا اور کچھ ہیجان بھی...... فوجی پریڈ بہرحال ہم بچوں کیلئے نئی چیز تھی۔ مجھے وہ فوجی دیکھنے میں تو بالکل خوفناک نہیں لگتے تھے لیکن پھر میں اپنے نانا، نانی اور بڑی عمر کے دوسرے لوگوں کو باتیں کرتے سنتی جن میں یہودیوں کو جلاوطن کرنے، انہیں اور دوسرے لوگوں کو ایذا رسانی کے مراکز میں لے جائے جانے، ان کے ناخن زنبور سے کھینچے جانے اور طرح طرح کے دوسرے مظالم ڈھائے جانے کا ذکر ہوتا، تو میں خوف زدہ ہو جاتی اور مجھے احساس ہوتا کہ ہمارے اردگرد کوئی بہت خوفناک گڑبڑ ہو رہی تھی۔ مجھے یہ بھی احساس ہوتا کہ جن فوجیوں کو میں پریڈ کرتے دیکھتی ہوں، وہ اتنے بے ضرر بھی نہیں ہیں جتنے مجھے نظر آتے ہیں۔ تاہم جب میں نانا، نانی یا کسی اور سے اس سلسلے میں کوئی سوال کرتی تو وہ یکدم خاموش ہو جاتے یا موضوع بدل دیتے۔ کبھی شاید وہ ہماری موجودگی کی طرف توجہ دیے بغیر، بے خیالی میں یہ باتیں شروع کر لیتے تھے اور جب ہم انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلاتے تھے تو انہیں خیال آتا تھا کہ یہ بچوں کے سامنے کرنے کی باتیں نہیں ہیں۔

بہرحال، اس وقت تک تو یہ گویا طوفان کی آمد آمد کی باتیں تھیں۔ اس کے بعد اصل طوفان بھی آ گیا۔ خوفناک بمباری شروع ہو گئی اور زندگی گویا اپنی جگہ جامد ہو کر رہ گئی۔ رفتہ رفتہ اسکول، سینما، تھیٹرز اور فیکٹریاں بند ہو گئیں۔ زندگی کا دوسرا نام گویا بمباری ہو کر رہ گیا جو درحقیقت موت کی پیامبر تھی۔ اتحادی فوجوں کیلئے نیپلز ایک اہم ہدف تھا کیونکہ یہ ایک اہم بندرگاہ اور اطالوی بحریہ کا مرکز بھی تھا۔ یہاں بہت سی اہم صنعتیں بھی تھیں۔ نیپلز کو تباہ کرنا اتحادی فوجوں کی نظر میں گویا اٹلی کی کمر توڑنے کے مترادف تھا چنانچہ نیپلز مسلسل، خوفناک فضائی حملوں کی زد میں تھا۔ آس پاس کے علاقے اور آبادیاں بھی ان حملوں کی زد میں آ رہی تھیں۔

جنگ کے آغاز پر تو بمباری کا نشانہ زیادہ تر ایسی چیزیں تھیں جن کی، فوجی نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت تھی لیکن بعد میں تو اندھا دھند ہر چیز پر بمباری ہونے لگی۔ اسکول، اسپتال، ہوٹل، بازار اور گرجا گھر تک اس بمباری سے محفوظ نہیں تھے۔ مجھے آج بھی اس زمانے کی باتیں یوں یاد ہیں جیسے کل ہی کی بات ہو۔ فضائی حملے سے خبردار کرنے کیلئے جیسے ہی سائرن بجتا، ہم سب اس قریبی سرنگ میں پناہ لینے کیلئے دوڑتے جس میں سے پزولی سے نیپلز جانے والی ریلوے لائن گزرتی تھی۔ ویسے تو مواصلات اور آمدورفت کے دوسرے ذرائع کی طرح ریلوے لائنیں بھی اتحادیوں کی بمباری کا نشانہ تھیں، اس کے باوجود یہ سرنگ ہمارے لئے ایک محفوظ ٹھکانہ تھی۔

ہم اپنے گدے لے کر اس سرنگ میں پہنچ جاتے۔ گدے ہم ریلوے لائن کے دونوں طرف ہی نہیں بلکہ بیچ میں بھی پتھروں پر بچھا لیتے۔ ہمیں معلوم تھا کہ ٹرینیں وہاں سے دن میں ایک آدھ بار ہی گزرتی تھیں، اس لئے ہم ٹرین سے کچلے جانے کا خطرہ تو محسوس نہ کرتے لیکن بمباری کی خوفناک آوازیں ہمیں دہشت زدہ کرنے کیلئے کافی ہوتیں۔ اس کے علاوہ سرنگ میں چوہے اور کاکروچ بہت ہوتے جو ہمیں سونے نہ دیتے۔ سرنگ میں ہوا بھی بہت کم آتی تھی، اوپر سے گھٹن اور سیلن کی وجہ سے سانس لینا بھی دشوار محسوس ہوتا۔ ویسے تو ہم سرنگ کو ایک محفوظ جگہ سمجھ کر پناہ لینے وہاں جاتے تھے لیکن یہ خوف لاحق رہتا کہ نہ جانے صبح ہم یہاں سے زندہ سلامت اپنے گھروں کو واپس جا سکیں گے یا نہیں؟

سرنگ میں ہم مل بانٹ کر گزارا کرتے۔ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہوتا، اس میں ایک دوسرے کو شریک کرتے اور ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھاتے۔ کبھی کبھی بچے تو کیا، بڑے بھی خوف اور پریشانی سے رونے لگتے۔ اس سرنگ میں بعض عورتوں نے بچوں کو جنم بھی دیا۔ وہاں گزرنے والی ہر رات کسی بھیانک خواب سے کم نہ تھی۔ صبح ساڑھے چار بجے والی ٹرین کی آمد سے پہلے ہم وہاں سے نکل کر بھاگتے کہ کہیں اس کے نیچے کچلے نہ جائیں یا اس کی زد میں نہ آ جائیں۔ کبھی کبھی بمباری سے خبردار کرنے کیلئے سائرن بج ہی نہ پاتا اور اچانک ہی بمباری شروع ہو جاتی۔ میں اتنی خوفزدہ ہوتی کہ گھبراہٹ میں کپڑے پہننے کے بجائے اتارنا شروع کر دیتی۔

(جاری ہے)

صوفیہ لورین کی داستان حیات

ہمارے فاقہ زدہ چہرے دیکھ کر اس عورت کو رحم آگیا

قسط 05

میں اپنی والدہ کا ہاتھ پکڑ کر پناہ گاہ کی طرف بھاگ گئی تھی۔ ایک بار اسی طرح بھاگنے کے دوران بم کا ایک ٹکڑا میری ٹھوڑی پر لگ گیا جس سے زخم آگیا اور خون بہنے لگا۔ اس روز میں سرنگ میں پہنچی تو زیادہ خوفزدہ تھی اور بری طرح رو رہی تھی۔ میری ٹھوڑی پر اس زخم کا نشان بہت سالوں تک رہا۔ صبح جب ہم سرنگ سے نکلتے تو کبھی کبھی میری والدہ مجھے اور میری بہن کو اپنے ساتھ قصبے کے مضافاتی علاقے تک لے جاتیں جہاں چرواہوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ وہاں رہنے والے ایک چرواہے کی، میرے ایک ماموں سے دوستی تھی۔ ایک بار اس نے ہمیں وہاں دیکھا تو شاید میرے اور ماریا کے چہرے پر درماندگی اور فاقہ زدگی کی نشانیاں دیکھ کر ہمیں تازہ دودھ پینے کیلئے دیا۔

وہ دودھ شاید کسی ایسی گائے کا تھا جس نے حال ہی میں بچھڑے کو جنم دیا تھا۔ وہ بہت گاڑھا تھا اور اس کا رنگ مکھن کی طرح پیلا تھا۔ اس دودھ کو پینے کے بعد مجھے اور ماریا کو دو تین دن تک بھوک نہیں لگی جو ہمارے نزدیک بہت ہی اچھی بات تھی کیونکہ گھر میں اکثر فاقہ کشی کی نوبت ہی آئی رہتی تھی۔ جنگ اور بمباری کی وجہ سے کھانے پینے کی چیزوں کی نقل و حمل انتہائی مشکل ہوگئی تھی، اس لئے اگر دکانیں کھلتی بھی تھیں تو ان پر مشکل سے ہی کوئی چیز ملتی تھی۔ ہر چیز کی راشن بندی ہوچکی تھی لیکن راشن بندی کے مطابق بھی چیزیں نہیں ملتی تھیں۔ بمباری سے پانی کی سپلائی کا نظام بھی تباہ ہوچکا تھا۔ لوگوں کی حالت بہت ہی خراب تھی۔

ماما لوئیسا قریبی دکان سے سودا سلف لینے اکثر مجھے ہی بھیجتی تھیں۔ یہ دکان ایک عورت ہی چلاتی تھی۔ مہینے کے ابتدائی تین چار دنوں کے بعد ہی اس کے ہاں ہمارا ادھار چلنا شروع ہوجاتا تھا۔ حالانکہ وہ بہت ناگواری سے ادھار دیتی تھی لیکن بہرحال...... دے دیتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے اور وہ غصے سے بڑبڑاتی ''لو بھئی...... پھر آگئی ادھار لینے والی......!'' تاہم اگر اس کے پاس ہماری مطلوبہ چیز موجود ہوتی تو دینے سے انکار نہ کرتی اور ایک خاکی کاغذ پر حساب لکھ لیتی۔

ایسے ہی خاکی کاغذ میں وہ ہمیں ڈبل روٹی لپیٹ کر دیا کرتی تھی۔ بعض اوقات تو میں ناقابل برداشت بھوک کی وجہ سے ڈبل روٹی کا کافی حصہ راستے میں ہی کھا جاتی۔ گھر میں ماما لوئیسا زیادہ تر کھانے کیلئے ایسی سستی ترین چیزیں بناتی تھیں جو بھوک مٹانے سے زیادہ دل بہلانے کیلئے ہوتی تھیں۔ وہ گویا ہمیں یہ تسلی دینے کی کوشش کرتی تھیں کہ ہم نے کچھ کھایا ہے۔ وہ بھی مجبور تھیں، بے چاری کیا کرتیں! بچپن کی یادوں میں میرے ذہن میں بھوک کی اذیت کے نقوش سب سے گہرے ہیں تاہم مجھے یہ بھی احساس ہے کہ میری نانی، ماما لوئیسا کو سب سے زیادہ تکلیف مجھے بھوکی دیکھ کر ہوتی تھی۔ وہ واقعی مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔

جوں جوں دن گزرتے گئے، حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ کھانے پینے کی چیزوں اور دیگر ضروریات زندگی کی سپلائی دھیرے دھیرے تقریباً ختم ہوگئی۔ اگر کوئی چیز میسر بھی ہوتی تھی تو اسے خریدنے کیلئے ہمارے پاس رقم نہیں ہوتی تھی اور اس کی قیمت بھی آسمان پر ہوتی تھی۔ کسی کسی دن تو ہمارے گھر میں کھانے کی کسی چیز کا ایک ذرہ بھی نہ ہوتا۔ ہولی وڈ کی فلم "The Four Days of Naples" میں اس زمانے کی کچھ جھلک موجود ہے اور کئی مناظر بڑے عمدہ پکچرائز کئے گئے ہیں۔ دوسری عالمگیر جنگ میں یوں تو اٹلی، جرمنوں کا ساتھ دے رہا تھا لیکن جو جرمن اس دوران اٹلی میں موجود تھے، ان کا رویہ اتنا خراب تھا کہ رفتہ رفتہ اطالوی ان کے خلاف ہوتے چلے گئے اور ان سے اتنے تنگ آگئے تھے کہ آخرکار انہیں اپنے ملک سے نکالنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ نیپلز اس مزاحمت میں سب سے آگے تھا اور اتحادی فوجوں کے پہنچنے سے پہلے ہی جرمنوں سے برسرپیکار ہوگیا تھا۔ ان کی یہ جدوجہد ہی درحقیقت اٹلی میں دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے کا نقطہ آغاز تھی۔

مگر جنگ کا اختتام اتنی آسانی سے نہیں ہوگیا تھا۔ اس سے پہلے پزولی نے بہت زیادہ تباہی اور مصائب دیکھے۔ بمباری اتنی شدید ہوگئی تھی کہ ہمیں قصبہ خالی کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ ہمارے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں جاکر ہم پناہ حاصل کرسکتے۔

آخرکار ماما لوئیسا کے کچھ رشتے دار جو نیپلز میں رہتے تھے، ہمیں اپنے ہاں بلانے پر بادل ناخواستہ تیار ہوئے۔ ہم ٹرین میں نیپلز کیلئے روانہ ہوئے۔ میرے دونوں ماموں، گائیڈو اور ماریو بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ ان دنوں جرمنوں نے صحت مند اطالوی نوجوانوں کو زبردستی اپنی فوج میں بھرتی کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہوا تھا۔ میرے دونوں ماموں اس امید پر بھی ہمارے ساتھ جارہے تھے کہ شاید جبری بھرتی سے بچ جائیں لیکن راستے میں وہ پکڑے جانے سے بال بال بچے۔

ایک اسٹیشن پر جرمن فوجی ہمارے کمپارٹمنٹ میں آگئے۔ وہ ٹرین میں بھی صحت مند اطالوی نوجوانوں کو تلاش کررہے تھے تاکہ انہیں اپنی فوج میں بھرتی کرسکیں۔ اس کمپارٹمنٹ میں چند راہبائیں بھی سفر کررہی تھیں۔ انہوں نے میرے دونوں ماموؤں کو اپنے ڈھیلے ڈھالے لبادوں میں چھپالیا اور وہ پکڑے جانے سے بال بال بچے۔ میں آج بھی اس واقعے کے بارے میں سوچتی ہوں تو بہت حیران ہوتی ہوں۔ ہم ان راہباؤں کیلئے قطعی اجنبی تھے، انہوں نے ہماری مدد کرکے اپنی جان خطرے میں ڈالی تھی۔ اگر جرمنوں کو اس بات کا پتا چل جاتا تو وہ ان راہباؤں کو موقع پر ہی گولی مار دیتے۔ ایسی مثالیں کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں کہ اجنبیوں کیلئے کوئی اپنی جان کی بازی لگا دے۔

نیا فیملی، جن کے ہاں ہم پناہ لینے پہنچے تھے، انہوں نے اتنی بدلحاظی تو نہیں دکھائی کہ ہمیں دیکھ کر اپنے گھر کے دروازے بند کرلیتے تاہم انہوں نے خاصی سرد مہری اور ہچکچاہٹ سے ہمارا استقبال کیا۔ میں اس وقت کم خوراکی اور فاقہ کشی کی وجہ سے ہڈیوں کا ڈھانچا بنی ہوئی تھی اور ماریا ٹائیفائیڈ بخار کی لپیٹ میں آئی ہوئی تھی جو ان دنوں پزولی میں پھیلا ہوا تھا۔

نیپلز میں ہمیں نیا فیملی کے ہاں پناہ تو میسر آگئی لیکن کھانے پینے کیلئے یہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ نوبت یہ آگئی کہ میری والدہ ہمارے لیے کھانے پینے کی کسی چیز کی خاطر گلی کوچوں میں جاکر لوگوں کے سامنے ہاتھ بھی پھیلانے لگیں۔ کبھی کبھار انہیں کوئی چھوٹی موٹی چیز مل جاتی، کبھی ایک آدھ آلو، کبھی چاولوں کی ایک مٹھی اور کبھی اس سستی ڈبل روٹی کا کوئی ٹکڑا جو اوپر سے کالی اور نہایت سخت ہوتی تھی۔ چھری سے کٹتی بھی نہیں تھی۔ میری والدہ مجھے اور ماریا کو ہمیشہ گھر پر چھوڑ کر جاتیں۔ انہیں اندیشہ رہتا کہ اگر وہ ہمیں ساتھ لے گئیں تو شاید واپسی پر نیا فیملی کے لوگ گھر کا دروازہ ہی بند کرلیں اور ہمیں اندر نہ گھسنے دیں، یوں ہم سے وہ مختصر سی جگہ بھی چھن جائے جو سر چھپانے کیلئے ہمیں اس گھر میں میسر آئی تھی۔

کبھی کبھار اگر ہمیں ڈبل روٹی بنانے والا تھوڑا سا آٹا میسر آجاتا تو میں اور سارا اسے گوندھ کر اس سے چھوٹی چھوٹی گڑیاں بناتیں اور انہیں سوکھنے کیلئے کھڑکی کے چھجے پر رکھ دیتیں لیکن دوسری صبح ہم سوکر اٹھتیں تو ہماری بھوک اتنی شدید ہوچکی ہوتی کہ ہم ایک ایک نوالے میں انہیں کچی ہی کھا جاتیں۔

ایک بار میری والدہ کھڑکی میں کھڑی تھیں کہ انہوں نے ایک عورت کو گلی سے گزرتے دیکھا جو اپنے بچے کو پرام گاڑی میں لے کر جارہی تھی۔ اس کے پاس ڈبل روٹی بھی تھی۔ میری والدہ دوڑ کر گلی میں گئیں اور اس کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئیں۔ ہم دونوں بہنیں کھڑکی میں کھڑی تھیں۔ والدہ نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس عورت سے ڈبل روٹی کا سوال کیا۔ انہیں شاید امید تھی کہ وہ عورت بچے والی ہونے کی وجہ سے ہم بچوں پر ترس کھائے گی۔ اس عورت نے ہمارے فاقہ زدہ چہروں کی طرف دیکھا اور اسے واقعی ہم پر ترس آگیا۔ وہ آدھی ڈبل روٹی میری والدہ کو دے گئی......

پھر 8 ستمبر 1943ء کا دن آیا جب جرمنوں کا رویہ اچانک بہت زیادہ بدل گیا۔ کہنے کو تو وہ اٹلی کے ساتھ تھے لیکن ان کا انداز ایسا ہی تھا جیسے انہوں نے اٹلی کو فتح کرلیا ہو اور جس تاریخ کا میں ذکر کررہی ہوں، اس دن سے تو ان کے رویے میں بے پناہ سفاکی آگئی۔ انہوں نے نیپلز کو اور بھی زیادہ ظالمانہ انداز میں گرفت میں لے لیا۔ کرفیو کا وقت اور بھی بڑھا دیا۔ اطالوی مردوں کی جبری بھرتی بھی زیادہ بڑے پیمانے پر شروع کردی۔ ملک کے جنوبی حصے میں اطالوی حکومت نے اتحادی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اتحادی فوجیں اٹلی کے جنوبی حصے میں گھس آئی تھیں اور جرمنوں نے شکست کی آہٹ سن لی تھی۔

انہوں نے اپنی جھنجلاہٹ ہم اطالویوں پر پہلے سے بھی زیادہ ظالمانہ انداز میں، سرعام نکالنی شروع کردی تھی۔ جھنجلاہٹ اطالویوں میں بھی کچھ کم نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی بھوک، بیماریوں اور بمباری کے ستائے ہوئے تھے۔ کہیں نہ کہیں ان کا ردعمل بھی سامنے آجاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روز نیوی کے ایک اطالوی جوان کو جرمنوں نے گرفتار کرلیا تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ وہ جنگ بندی کی خبر سن کر خوشی منا رہا تھا۔ شاید اسے بھی دوسرے لاکھوں اطالویوں کی طرح امید ہوچلی تھی کہ اب امن لوٹ آئے گا، دھیرے دھیرے جنگ کے زخم بھر جائیں گے اور زندگی معمول پر آجائے گی۔ اس امید کو دل میں جگہ دینے اور اس پر خوشی کا اظہار کرنے کی اسے بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ اسے یونیورسٹی کی سیڑھیوں پر، ہزاروں اطالویوں کے مجمع کے سامنے گولی ماردی گئی اور مجمع کو جرمن فوجیوں نے مجبور کیا کہ وہ اس پر تالیاں بجائے۔

جرمنوں کے اس قسم کے مظالم کی وجہ سے رفتہ رفتہ اطالوی ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے خلاف نفرت اور بغاوت شہر شہر، گلی گلی...... اور پھر گھر گھر پھیلنے لگی۔ ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگ ان سے لڑنے کے لیے متحد ہونے لگے۔ جرمن، جو اطالویوں کے ہمدرد اور ساتھی بن کر اٹلی میں آئے تھے، انہوں نے نیپلز پر اپنی ظالمانہ گرفت مضبوط رکھنے کے لیے کوششیں تیز کردیں۔ انہوں نے اٹھارہ سے 35 سال تک کی عمر کے مردوں کو بیگار کے لیے بھرتی کرنے کی غرض سے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ شہر میں کم از کم تیس ہزار ایسے مرد ہوں گے جن کی عمر ان حدود میں آتی ہوگی لیکن اس اعلان کے بعد بہ مشکل ڈیڑھ سو مرد، جرمن فوجیوں کے سامنے حاضر ہوئے۔ 27 ستمبر تک تو نیپلز کے شہریوں اور جرمنوں کے درمیان علی الاعلان لڑائی شروع ہوگئی۔

نوجوان اس جنگ میں پیش پیش تھے جو ایک طرح سے غاصبوں کے خلاف تھی اور ان نوجوانوں کو قومی ہیروز اور انقلابیوں کا سا درجہ مل رہا تھا۔ نیپلز کے شہریوں کے اس طرح اٹھ کھڑے ہونے کی وجہ سے جرمن، تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی اتحادی فوجوں کے سامنے مزاحمت کے لیے منظم نہ ہوسکے اور چند ہی دنوں میں ان کا دماغ ٹھکانے آگیا۔ انہوں نے مقامی باغیوں سے بھی سمجھوتا کرلیا اور تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی اتحادی فوجوں کے سامنے بھی پسپائی اختیار کرلی۔ آخرکار یکم اکتوبر 1943ء کو جنرل کلارک کی قیادت میں اتحادی فوجیں شہر میں داخل ہوگئیں۔

اتحادی فوجیوں کے دستوں میں سب سے پہلے میں نے اسکاٹش فوجیوں کو دیکھا جن کی وردی میں اسکرٹ یا فراک جیسی قمیض بھی شامل تھی۔ وہ شہر کی سڑکوں سے پریڈ کرتے ہوئے گزر رہے تھے اور مقامی نوجوان مسرت بھرے نعرے لگا کر ان کا استقبال کررہے تھے۔ امریکی فوجی، مقامی لوگوں میں بسکٹ، چاکلیٹ اور چیونگم تقسیم کررہے تھے۔ ایک فوجی نے میری طرف بھی چاکلیٹ پھینکی۔ اس عمر تک میں نے کبھی چاکلیٹ کھائی ہی نہیں تھی اور میں اس کے ذائقے سے آشنا نہیں تھی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ ہے کیا چیز...... چنانچہ میں نے وہ کسی اور کو دے دی۔ البتہ میں فوری تیار ہونے والی کافی کا ایک ڈبا لے کر گھر آگئی اور وہ میں نے ماما لوئیسا کو دے دیا۔ ان کی سمجھ میں بھی دیر سے آیا کہ وہ کیا چیز تھی، کیونکہ ہمارے ہاں کافی کے بیجوں کو پیس کر کافی تیار کی جاتی تھی...... اور اب تو عرصہ ہوا، ہم اس کا ذائقہ بھی بھول چکے تھے۔ ماما لوئیسا کو یہ جان کر خاصی حیرت ہوئی کہ اس نسواری سفوف نما چیز کو محض گرم پانی میں گھول کر، کتنی آسانی سے کافی تیار کی جاسکتی تھی۔

آخرکار جنگ ختم ہوئی اور اس امر کے لیے حالات کچھ سازگار دکھائی دینے لگے کہ زندگی کے معمولات نئے سرے سے شروع کیے جائیں۔ ہم لوگ پزولی واپس آگئے۔ میری چھوٹی بہن ماریا ابھی بیمار ہی تھی اور اسے ہمارے ایک ماموں نے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ جس بلڈنگ میں ہمارا اپارٹمنٹ تھا، اسے بمباری سے کافی نقصان پہنچا تھا لیکن بہرحال وہ اپنی جگہ کھڑی تھی...... اور اس کے مکینوں کے لیے یہی کافی تھا۔ ہم نے ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں میں گتے اور ہارڈ بورڈ وغیرہ کے ٹکڑے لگائے اور اپنے اجڑے ہوئے سے اپارٹمنٹ میں رہنا شروع کردیا۔

کھانے پینے کی چیزیں حاصل کرنے کے لیے ہم ان دکانوں کے سامنے قطاروں میں کھڑے ہونے لگے جہاں سے یہ سب کچھ بلیک میں ملتا تھا۔ بھوک پیاس کے ساتھ اب ہمیں کچھ نئی چیزوں سے بھی نمٹنا پڑتا تھا...... اور یہ تھیں کھٹمل، کاکروچ اور اس طرح کی دو ایک دوسری مخلوق، جو بلڈنگ کے خالی رہنے کے دوران اس میں پیدا ہوگئی تھیں۔ آخرکار ایک امریکی ایجاد، یعنی ڈی ڈی ٹی پاؤڈر کے مسلسل استعمال نے ہمیں کافی دنوں میں ان مصیبتوں سے نجات دلائی۔ تب مجھے صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ اب واقعی جنگ ختم ہوگئی ہے۔

اتحادی فوجی فاقہ زدہ شہریوں کے درمیان کھانے پینے کی چیزیں بھی تقسیم کرتے تھے جن میں سفید ڈبل روٹی بھی شامل تھی جو ہمارے لیے بہت بڑی عیاشی تھی۔ دیہی علاقوں میں کسانوں نے فصلیں اگانے کی کوششیں شروع کردی تھیں۔ اس بار موسم سرما آیا تو سردی کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگی۔ ہم سب زیادہ تر کچن میں جمع رہتے۔ گھر میں صرف وہی جگہ تھی جہاں کچھ حرارت میسر تھی۔ اب گھر میں ہم نو افراد تھے۔ ہمارا ایک کزن بھی ہمارے ساتھ رہنے آگیا تھا۔ ہم زیادہ تر اکٹھے بیٹھنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح سردی کچھ کم لگتی لیکن جب ہمیں گھر سے نکلنا پڑتا تو دنیا بڑی بے رحم سی جگہ محسوس ہوتی۔

مراکش کے فوجیوں کا ایک دستہ، جس کی قیادت ایک فرانسیسی آفیسر کررہا تھا، ہماری بلڈنگ کے داخلی ہال میں آکر قیام پذیر ہوگیا۔ بلڈنگ میں داخل ہونے کا راستہ بھی ان کے استعمال میں رہنے لگا۔ یہ بہت ہی اجڈ اور غیر مہذب سے لوگ تھے۔ صبح منہ اندھیرے سے رات کی تاریکی پھیلنے تک یہ لوگ چاروں طرف دندناتے پھرتے رہتے اور کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو کسی بھی گھر کا دروازہ دھڑ دھڑا دیتے، چاہے مکین اس وقت گہری نیند میں ہوتے۔ ان لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے ہمیں تحفظ کے بجائے عدم تحفظ کا احساس ہونے لگا۔ تاہم اس کے کم و بیش پندرہ برس بعد مجھے انہی تجربات اور یادوں کی وجہ سے فلم "Two Women" کے ایک سین کو زیادہ ڈرامائی اور حقیقت سے قریب تر بنانے میں بڑی مدد ملی۔

میں صبح اسکول کے لیے نکلتی تو بلڈنگ میں نیچے، چاروں طرف ایسی چیزیں بکھری ہوتیں جو ان فوجیوں کی، رات کی سرگرمیوں کی نشاندہی کرتی تھیں لیکن میں کمسن تھی۔ میں ان نشانیوں کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ میں تو ایک بار ربڑ کی ایک چیز کو غبارہ سمجھ کر اوپر بھی اٹھا لائی جس پر ماما لوئیسا نے مجھے ڈانٹ پلائی۔ اس وقت مجھے اس ڈانٹ کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ ماما لوئیسا نے جاکر فوجی دستے کے فرانسیسی سربراہ سے بھی شکایت کی، جس کے بعد وہ لوگ کچھ محتاط ہوگئے۔

(جاری ہے)

صوفیہ، کیری گرانٹ اور ڈوروتھی گس مین

قسط :06

میری والدہ نے دو چار پینی کمانے کے لیے گھر کے سامنے ہی، سڑک کے دوسری طرف واقع ایک کیفے میں پیانو بجانا شروع کر دیا تھا۔ ماریا گو کہ عمر میں مجھ سے چھوٹی تھی لیکن اس میں خود اعتمادی مجھ سے کہیں زیادہ تھی۔ کبھی کبھی وہ بھی مما کے ساتھ چلی جاتی اور اپنی بچکانہ آواز میں گانے سناتی۔ گھر کے ماحول کے لیے ترسے ہوئے امریکی فوجیوں کو کبھی کبھار ہمارے گھر پر بھی مدعو کر لیا جاتا اور وہاں ایک چھوٹی موٹی پارٹی کا ساماں ہو جاتا جس میں میرا کام بوقت ضرورت صرف گلاس دھو کر لانا ہوتا۔ اس قسم کی پارٹیوں سے بھی ماما لوئیسا کو تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی۔

ایسی ہی ایک پارٹی میں ایک امریکی فوجی نے میری تھوڑی پر زخم کا نشان دیکھ کر اس کے بارے میں پوچھا اور پھر مجھے ایک کیمپ کے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے نہ جانے کون سی دوا وغیرہ لگائی، جس کے بعد ایسا لگا جیسے جادو کے زور سے وہ نشان غائب ہو گیا ہو۔ اس امریکی فوجی کو گویا ہمارے ساتھ اتنی ہمدردی کر کے بھی تسلی نہیں ہوئی۔ ہمیں واپس بھیجتے وقت اس نے جیپ میں بہت سارا، کھانے پکانے کا سامان بھی ہمارے ہمراہ کر دیا، جس میں سویاں تک شامل تھیں۔ کھانے پکانے کا اتنا ڈھیر سارا سامان ہم نے ایک طویل عرصے سے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

اس دوران مما نے مجھے بھی پیانو بجانا سکھانے کی کوشش شروع کر دی۔ مجھے پیانو بجانے کا شوق تو تھا لیکن میں ذرا سی بھی غلطی کرتی تو مما غصے میں آ جاتیں اور میرے سر پر اتنے زور سے تھپڑ مارتیں کہ میرے سر میں درد ہو جاتا۔ بار بار سر میں درد ہونے کی وجہ سے آخر کار میں نے پیانو سیکھنا چھوڑ دیا۔ دل بہلانے کے لیے میں نے قریبی سینماؤں میں فلم دیکھنے جانا شروع کر دیا۔ یہ سینما ہاؤس جنگ کے دوران ٹوٹ پھوٹ گیا تھا اور بند ہو گیا تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد یہ دوبارہ کھلا تو ہمارے شہر میں امریکی فلمیں آنے لگیں۔ میں نے اس سینما ہاؤس میں Blood and Sand کئی بار دیکھی۔ اس کے ہیرو ٹائرون پاور اور ہیروئن ریٹا ہیورتھ کی شخصیات نے گویا مجھ پر جادو کر دیا۔ خاص طور پر ریٹا ہیورتھ کے بال تو مجھے بہت ہی اچھے لگے۔

اس کے بعد میں نے Duel In The Sun دیکھی۔ اس نے بھی مجھ پر ویسا ہی سحر طاری کر دیا جیسا پہلی فلم نے کیا تھا۔ اس کی ہیروئن جینفر جونز اور ہیرو گریگری پیک کی کھوئی کھوئی نظریں مجھے نہ جانے کس دنیا میں لے گئیں۔ کمسن ہونے کی وجہ سے مجھے واضح طور پر اس کا شعور نہیں تھا لیکن میرا خیال ہے میرے اندر ایک قسم کا احساسِ تنہائی موجود تھا۔ احساسِ تنہائی کے مارے لوگ عام طور پر اپنے خیالوں کی ایک الگ دنیا بسا لیتے ہیں۔ وہ جو فلمیں دیکھتے ہیں یا جو کتابیں پڑھتے ہیں، ان کے کردار ہی ان کے ساتھی بن جاتے ہیں، وہ ان کی تنہائیوں کے رفیق ہوتے ہیں۔ میں جو فلمیں دیکھتی تھی، ان کی ہیروئنوں سے اس لیے متاثر نہیں ہوتی تھی کہ وہ بہت خوبصورت نظر آتی تھیں یا وہ قابلِ رشک زندگی بسر کرتی دکھائی دیتی تھیں بلکہ مجھے ان کی یہ خوبی سحر زدہ کرتی تھی کہ وہ جو کچھ محسوس کرتی تھیں، اسے الفاظ یا تاثرات کی مدد سے بہت ہی خوبصورتی سے بیان کرنے یا ظاہر کرنے پر قادر تھیں۔

جنگ کے بعد اسکول بھی دوبارہ کھل گئے تھے اور میں پڑھائی میں دل لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پڑھائی مجھے اچھی لگتی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں میری دلچسپی کم ہوتی جا رہی تھی۔ میرے رپورٹ کارڈز پر میرے نمبر بتدریج کم ہوتے جا رہے تھے تاہم میری کیمسٹری اور فرانسیسی کی ٹیچر مجھ سے بہت خوش تھیں اور مجھے پیار کرتی تھیں۔ ان دونوں مضامین میں، میں اچھی تھی۔ زبانیں سیکھنا تو ویسے ہی مجھے بہت اچھا لگتا تھا اور آسان محسوس ہوتا تھا۔ میری اس صلاحیت یا خوبی نے آگے چل کر میرے فلمی کیریئر میں میری بڑی مدد کی۔ تاہم اس وقت تک مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ آگے چل کر میں کیا بنوں گی یا مجھے کیا بننا چاہیے۔

زیادہ سے زیادہ، بس میں ٹیچر بننے کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ شاید اس لیے کہ یہ میرے والد کی خواہش تھی کہ میں ٹیچر بنوں۔ مجھے کم از کم یہی یاد پڑتا ہے لیکن معروف اداکارہ بننے کے بعد جب مجھے ایک بار پزولی میں اپنے آبائی گھر میں جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے وہاں اپنے بچپن کی ایک نوٹ بک ملی جس میں ایک جگہ میں نے لکھا تھا "صوفیہ ایک روز اداکارہ بنے گی۔"

میں یہ جملہ پڑھ کر حیران رہ گئی۔ مجھے بالکل یاد نہیں تھا کہ یہ جملہ میں نے اپنی نوٹ بک میں کب اور کیوں لکھا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اداکاری کی صلاحیتیں اور دوسروں کے سامنے کچھ پرفارم کر کے دکھانے کی صلاحیت اور جرأت مجھ سے زیادہ میری بہن ماریا میں موجود تھی۔ گھر میں مہمان آتے تھے تو ماریا سے فرمائش کی جاتی تھی کہ وہ کوئی گانا سنائے، کسی کی نقل اتار کر دکھائے یا کسی کردار کی اداکاری کر کے دکھائے۔ ماریا ذرا بھی ہچکچائے بغیر یہ فرمائش پوری کر دیتی تھی۔ پرفارم وہ کرتی تھی لیکن میں ایک کونے میں کھڑی ہو کر اسے دیکھتے ہوئے بھی شرماتی رہتی تھی۔

تاہم یہ بچپن کی باتیں تھیں۔ بچپن میں، میں جسمانی طور پر بھی سوکھی سڑی تھی اور میری شخصیت میں کوئی کشش نہیں تھی لیکن جوں جوں میں بڑی ہوتی گئی، میرا جسم بھرتا گیا اور میری شخصیت میں کچھ دلکشی آنے لگی۔ میرا چہرہ بھی بہتر ہونے لگا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ میں دل ہی دل میں جو کچھ سوچتی تھی، محسوس کرتی تھی، اس کا اظہار کرنے کی خواہش بھی میرے دل میں مچلنے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں کسی بیکراں سمندر میں چھلانگ لگانا چاہتی ہوں، خواہ مجھے تیرنا نہیں آتا تھا۔

نوجوانی کی حدود میں قدم رکھتے ہی بہت تیزی سے میری کایا پلٹنے لگی۔ میں بچپن میں سوکھی سڑی اور کسی حد تک بدشکل ہی دکھائی دیتی تھی لیکن پھر میرا جسم اور چہرہ بھرنے لگا، صحت بہتر ہو گئی اور میں اچھی خاصی خوبصورت دکھائی دینے لگی۔ میری آنکھوں میں چمک آ گئی۔ رخسار گویا دمکنے لگے۔

میرے پاس ایک پرانے صندوقچے میں یادوں کا جو خزانہ محفوظ ہے اور جو مجھے ماضی کی بھول بھلیوں میں لے گیا تھا، اس میں ایک میگزین بھی تھا جس کے سرورق پر میری تصویر تھی۔

یہ تصویر گویا ماضی کے دریچے سے جھانک کر میری طرف دیکھ رہی تھی یا پھر شاید میں ماضی کے دریچے سے جھانک کر خود اپنی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس اطالوی میگزین کے صفحات زرد ہو چکے تھے لیکن سرورق اب بھی خاصی اچھی حالت میں تھا۔ اس میگزین میں فرضی رومانس کی مختصر سی کہانیاں شائع کی جاتی تھیں اور انہیں کسی خوبصورت لڑکی کی تصویروں سے سجایا جاتا تھا۔ وہ ایک طرح سے کسی رومانی کہانی پر مبنی باتصویر فیچر ہوتا تھا۔ ایک شمارے میں جتنی باتصویر کہانیاں شامل ہوتی تھیں، ان میں سے جس لڑکی کی تصویروں کو سب سے زیادہ خوبصورت سمجھا جاتا تھا، اسی کی ایک تصویر سرورق پر بھی شائع کی جاتی تھی۔ یعنی وہ اس شمارے کی کور گرل یا ٹائٹل گرل ہوتی تھی۔ یہ 1951ء کا ایک شمارہ تھا اور اس شمارے کی کور گرل میں تھی۔

نوجوانی مجھ پر ایک انقلاب کی طرح آئی تھی۔ میں جب عمر کے پندرہویں سال میں تھی تو میں نے محسوس کیا تھا جیسے میری روح کسی اور لڑکی کے حسین جسم میں منتقل ہو گئی ہے۔ مجھے وہ صورت، وہ جسم، وہ حسین نشیب و فراز اپنے لگتے ہی نہیں تھے۔ اس عمر میں ہی میرے ساتھ یہ ہونے لگا تھا کہ میں پزولی کی گلیوں میں نکلتی تو راہ چلتے لڑکے مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتے تھے اور ان میں سے بعض تو بے اختیار سیٹی بھی بجاتے تھے۔ اگر اسے خود ستائشی نہ سمجھا جائے تو میں کہوں گی کہ میں اپنی جاننے والی تمام ہم عمر لڑکیوں میں سب سے خوبصورت تھی۔ میں نے خود بھی نہیں سوچا تھا کہ ذرا بڑی ہونے پر میری شخصیت میں ایسا انقلاب آئے گا اور میرا سراپا یوں یکسر بدل جائے گا۔

نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی میری شخصیت اور اور سراپا میں نمودار ہونے والی تبدیلیوں کو سب سے پہلے ہمارے پی ٹی کے ٹیچر نے محسوس کیا۔ ظاہر ہے وہ ہمیں فزیکل ٹریننگ کراتے تھے یعنی جسمانی تربیت دیتے تھے، ورزشیں وغیرہ کراتے تھے۔ میرا خیال ہے، ہمارے خدوخال شاید انہی کے سامنے سب سے زیادہ نمایاں ہوتے ہوں گے۔ ہمارے وہ پی ٹی ٹیچر نوجوان اور ورزشی جسم کے مالک تھے۔ وہ صرف نام کے ہی پی ٹی ٹیچر نہیں تھے، انہیں واقعی ورزش کا بہت شوق تھا اور وہ پوری دنیا کو ہی ورزش کی جگہ سمجھتے تھے۔

موسم بہار کی ایک صبح اچانک ہی وہ ہمارے اپارٹمنٹ کے دروازے پر نمودار ہوئے اور بلاتمہید انہوں نے میری والدہ سے میرا رشتہ مانگ لیا۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ انہوں نے ہیٹ اتار کر میری والدہ کو تعظیم دی اور بات آگے بڑھائی۔ "محترمہ رومیلڈا! آپ کی صاحبزادی کے لیے میرے دل میں بہت اچھے خیالات ہیں اور میرا خیال ہے کہ ان سے شادی کے لیے میں ایک موزوں امیدوار ہوں۔ میرا گھر ذاتی ہے اور میری ملازمت مستقل ہے۔ اگر آپ کی رضامندی شامل ہو تو میں اور صوفیہ ستمبر میں شادی کر سکتے ہیں۔"

میری والدہ چند لمحوں کے لیے تو دم بخود رہ گئیں پھر حیرت کے جھٹکے سے سنبھل کر بولیں۔ "ڈیئر ٹیچر! میں معذرت چاہتی ہوں، صوفیہ ابھی بہت کم عمر ہے، فی الحال تو ہم اس کی شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔"

مما نے نرمی اور شائستگی سے مزید کچھ باتیں کرنے کے بعد آخر کار انہیں واپس بھیج دیا۔ میں مما سے کچھ فاصلے پر کھڑی یہ سب کچھ اس طرح دیکھ اور سن رہی تھی جیسے یہ ساری باتیں کسی اور کے بارے میں ہو رہی ہوں تاہم یہ ضرور تھا کہ جب میرے ٹیچر چلے گئے تو میں نے محسوس کیا جیسے میرے سر پر اچانک آن پڑنے والا کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ میں تو ابھی ٹھیک طرح سے یہی نہیں سمجھ پائی تھی کہ میں کون ہوں، کیا ہوں، دنیا میں کس لیے آئی ہوں اور مجھے کیا بننا ہے؟ ابھی بھلا میں شادی کے بارے میں کس طرح سوچ سکتی تھی؟

اس کے کچھ عرصے بعد البتہ ایک لڑکا مجھے اچھا لگنے لگا۔ اسے میں نے کئی بار اپنی گلی اور قریبی بازار میں دیکھا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ وہ ہمارے قصبے سے کچھ دور، کسی دوسرے قصبے میں رہتا تھا۔ اس سے تھوڑی سی بات چیت ہوئی تو اس نے مجھے ایک جگہ ملاقات کی دعوت دی۔ میں ہمت کر کے کسی طرح وہاں جا پہنچی لیکن تنہائی میں ملاقات میں وہ مجھے بالکل مختلف نظر آیا۔ اس کی آنکھیں بھی کچھ سرخ ہو رہی تھیں، معلوم نہیں وہ کچھ پیئے ہوئے تھا یا یہ جوانی کے جوش کی سرخی تھی۔ اس کے انداز میں بھی کچھ جارحانہ پن تھا۔ میں تو موقع ملتے ہی وہاں سے بھاگ آئی اور اس کے بعد میں نے کبھی اس کا سامنا نہیں کیا۔ میں ظاہری طور پر جوان نظر آنے لگی تھی لیکن اندر سے شاید ابھی میں بچی ہی تھی۔

عملی زندگی میں مجھے کس ڈگر پر چلنا تھا، اس سمت میں پہلا قدم اٹھانے کا موقع مجھے نیپلز میں منعقد ہونے والے ایک مقابلہ حسن کے ذریعے ملا۔ میں تو شاید اپنی غربت اور شرمیلی طبیعت کی وجہ سے اس قسم کے کسی مقابلے میں حصہ لینے کے بارے میں سوچ بھی نہ پاتی لیکن میری والدہ میرے لیے وہ گاڈ مدر یا پری بن گئیں جو سنڈریلا کو اس کی غربت اور شرمیلے پن کے باوجود، ہاتھ پکڑ کر شہزادے کی تقریب میں لے گئی تھی۔

ہوا یوں کہ 1949ء کے موسم خزاں کے دوران ایک روز ہمارے ایک پڑوسی شام کا ایک اخبار اٹھائے ہمارے گھر آئے اور انہوں نے ہماری توجہ اس میں چھپے ہوئے ایک اشتہار کی طرف مبذول کرائی۔ اشتہار اس اخبار کی اپنی طرف سے تھا۔ اخبار نے اعلان کیا تھا کہ اس کے زیر اہتمام نیپلز میں ایک مقابلہ حسن منعقد کرایا جا رہا تھا جس میں ایک ملکۂ حسن کا انتخاب کیا جانا تھا جسے "کوئین آف دی سی" کا خطاب ملنا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی بارہ ساتھیوں کا انتخاب بھی ہونا تھا۔ ان بارہ خوبصورت لڑکیوں کو "شہزادی" کا خطاب ملنا تھا۔ انتخاب کے بعد ان تیرہ لڑکیوں کو ایک نہایت خوبصورت بگھی میں بیٹھ کر نیپلز کی خاص خاص سڑکوں سے گزرنا تھا۔ اس غیر روایتی قسم کے مقابلۂ حسن کے پیچھے اصل میں یہ آئیڈیا کارفرما تھا کہ جنگ کی تباہ کاریوں کے باعث ابھی تک شہر کی بہت سی عمارات، کھنڈرات کی صورت میں پڑی تھیں جن کی وجہ سے شہر بدصورت نظر آتا تھا۔ اس مقابلۂ حسن کے ذریعے ایک تو شہر میں خوبصورتی کا تاثر اجاگر کرنا، دوسرے ان تباہ شدہ عمارتوں کی تعمیر نو کے لیے جذبہ اور تحریک پیدا کرنا مقصود تھا۔

(جاری ہے)

صوفیہ لورین کی داستان حیات

مقابلۂ حسن میں شرکت کے لئے

میرے پاس نیا لباس نہیں تھا

قسط :07

اشتہار پڑھتے ہی مما کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آگئی۔ پھر انہوں نے پُرخیال نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان کے ذہن میں یقیناً کوئی خاص خیال ابھرا تھا یا پھر شاید خیال تو پہلے سے موجود تھا لیکن اب اس پر عملدرآمد کا وقت آگیا تھا۔ خود اپنے بارے میں مما نے جو خواب دیکھے تھے اور جنہیں تعبیریں نہیں مل سکی تھیں، شاید وہ اب میرے ذریعے ان کی تعبیریں تلاش کرنے کے ارادے باندھ رہی تھیں۔ انہوں نے ابھی تک ان خوابوں کو فراموش نہیں کیا تھا۔

''صوفیہ! تمہیں اس مقابلۂ حسن میں حصہ لینا ہوگا۔'' انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

میں خاموش رہی تو مما نے ذرا زور دے کر پوچھا۔ ''کیا کہتی ہو؟'' ان کے لہجے میں التجا بھی تھی اور اندیشے بھی۔ اپنی تمام تر کم عمری اور ناسمجھی کے باوجود میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ میرے منہ سے انکار سننا نہیں چاہتی تھیں۔ ان کے سوال کے پیچھے نہ جانے کتنی امیدیں اور کتنے ارمان چھپے ہوئے تھے۔ میں چاہتی بھی تو شاید انکار میں جواب نہ دے پاتی۔

''اگر آپ کہتی ہیں تو ٹھیک ہے......'' میں نے اپنے مخصوص، دھیمے اور قدرے شرمیلے لہجے میں کہا۔

میری عمر اتنی نہیں تھی کہ میں اس مقابلۂ حسن میں شامل ہوسکتی لیکن مما نے میرا ہیئر اسٹائل کچھ ایسا بنایا کہ میری عمر تھوڑی سی زیادہ معلوم ہونے لگی۔ وہ دل و جان سے مجھے اس مقابلے کے لیے تیار کرنے میں جت گئیں۔ اس بار تو ماما لوئیسا نے بھی مما کے ارادے کی مخالفت نہیں کی اور خود بھی...... خواہ بادل ناخواستہ ہی سہی...... لیکن بہرحال مما کا تھوڑا بہت ہاتھ بٹانے لگیں۔ ہمارے گھر میں اب بھی غربت تھی۔ جنگ ختم ہوئے گوکہ کچھ عرصہ گزر چکا تھا لیکن ہمیں اب بھی کبھی کبھار فاقوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ ہمارے وسائل اتنے نہیں تھے کہ مجھے مقابلۂ حسن اور اس سے متعلق تقریبات میں کسی خاص اہتمام سے بھیجا جاسکتا۔ میرے پاس کوئی نیا لباس تک نہیں تھا۔ کھڑکیوں کے پردے اُتار کر، انہیں کاٹ چھانٹ کر ان سے میرا لباس تیار کیا گیا۔

میرے پاس جوتوں کی ایک ہی جوڑی تھی جو خاصی پرانی دکھائی دیتی تھی۔ ان پر سفید پالش کرکے انہیں حتی الامکان نیا ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی۔ ساتھ ہی میری والدہ نے نیچی اور قدرے لرزتی سی آواز میں دعا کی۔ ''اللہ کرے اس روز بارش نہ ہو......'' بارش ہونے کی صورت میں سفید پالش کے اتر جانے یا خراب ہونے کا خطرہ تھا۔

مقررہ دن آیا تو میں اور مما ٹرین کے تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں بیٹھ کر نیپلز روانہ ہوئے۔ کمپارٹمنٹ میں موجود تمام مسافر بار بار، غور سے ہماری طرف دیکھنے لگتے تھے۔ میرے انداز اور حلیے سے صاف ظاہر تھا کہ میں اپنی بساط کے مطابق انتہائی اہتمام سے تیار ہوکر کسی خاص تقریب میں جارہی ہوں۔ اب یہ دوسری بات تھی کہ ذرا سی بارش ہوجاتی تو میری یہ ساری تیاریاں دھری رہ جاتیں اور میں بھیگی ہوئی کوئی انتہائی بدحال بلی دکھائی دیتی۔ میرے سب خواب ادھورے رہ جاتے۔

مقابلۂ حسن کی کارروائیاں ایک سینما ہال سے شروع ہوتی تھیں اور شہر کی ایک شاہراہ پر واقع میونسپل بلڈنگ میں ختم ہوتی تھی جو اس زمانے میں شہر کی خوبصورت عمارات میں شمار ہوتی تھی مگر اب وہ متروک ہوچکی ہے اور خستہ حالت میں ہے۔ اس وقت بھی اسے بمباری سے کچھ نقصان پہنچ چکا تھا۔ شہر کی تعمیر نو کے لیے مختلف انداز سے جو کوششیں جاری تھیں، ان میں اس عمارت کی مرمت کا کام بھی شامل تھا۔

میں مما کے ساتھ کچھ اس طرح سینما ہاؤس پہنچی جیسے قصاب کسی بھیڑ کو ذبح کرنے کے لیے مذبح خانے میں لایا ہو۔ مقابلۂ حسن کے جج وہاں موجود تھے۔ مقابلے میں شرکت کے لیے سو سے زائد لڑکیوں کو منتخب کیا گیا تھا، میں بھی ان میں شامل ہوگئی۔ اب ہم میں سے کسی ایک کو ملکۂ حسن اور بارہ لڑکیوں کو اس کی ساتھی منتخب ہونا تھا۔ مجھے یہ تو اندازہ نہیں ہوسکا کہ میں ان سب سے زیادہ خوبصورت نظر آرہی تھی یا نہیں...... لیکن یہ دیکھ کر تھوڑا سا اطمینان ضرور ہوا کہ اپنی تمام تر غربت، شرم اور جھجک کے باوجود میں کم ازکم ان تمام لڑکیوں سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور دکھائی دے رہی تھی۔ یہ بات شاید ججوں نے بھی محسوس کرلی تھی۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوا کہ وہاں پہنچتے ہی تمام جج میری طرف متوجہ ہوئے تھے۔

ججوں کے سامنے سے پریڈ کے انداز میں گزرنے کے دوران میں نے بھی دوسری لڑکیوں کی طرح مسکرانے، شوخ وشنگ نظر آنے اور ناز و ادا دکھانے کی کوشش کی...... اور شاید میں اپنی اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب رہی۔ اپنی غربت، کم مائیگی، شرم اور جھجک کا احساس کچھ دیر کے لیے شاید ذہن کے کسی تاریک گوشے میں چلا گیا۔ سالہا سال فلمی دنیا میں گزارنے کے بعد آج بھی میرا یہی عالم ہے۔ سیٹ پر جانے اور کیمرے کا سامنا کرنے سے پہلے آج بھی مجھ پر شرم، جھجک اور گھبراہٹ طاری رہتی ہے لیکن لائٹس اور کیمرا آن ہونے کے بعد گویا مجھ میں کوئی اور ہی روح حلول کرجاتی ہے، میں سب کچھ بھول جاتی ہوں اور نہ جانے کس طرح اچھی سے اچھی پرفارمنس دینے میں کامیاب ہوجاتی ہوں۔

ملکۂ حسن، اور اس کے بعد دوسری بارہ لڑکیوں کے انتخاب کے مراحل مجھے بہت طویل محسوس ہوئے۔ میں ملکۂ حسن تو منتخب نہیں ہوسکی کیونکہ ججوں کے خیال میں میری خوبصورتی ذرا الگ قسم کی تھی، ان کے نکتۂ نظر کے مطابق میں حسن کے روایتی اور مروجہ پیمانوں پر اس حد تک پورا نہیں اترتی تھی کہ مجھے ملکۂ حسن منتخب کیا جاتا لیکن باقی بارہ لڑکیوں میں مجھے پہلے نمبر پر منتخب کیا گیا۔ میرے لیے یہ بھی کچھ کم سنسنی خیز نہیں تھا۔ یہ گویا میری زندگی کی پہلی اہم کامیابی تھی جس نے مجھے کچھ ایسی خود اعتمادی بخشی جو آج تک میرے ساتھ چل رہی ہے۔

ہر لڑکی کے منتخب ہونے پر تالیاں بج رہی تھیں، تصویریں کھنچ رہی تھیں، میوزک بج رہا تھا، انٹرویو لیے جارہے تھے اور کیمروں کے فلیش بلب یکے بعد دیگرے جھماکوں سے ماحول کو جگمگا رہے تھے۔ ہم پر پھول برسائے جارہے تھے۔ دنیا میں پہلی بار میری موجودگی کو اس طرح محسوس کیا گیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں دنیا میں آئی ہی اب ہوں، اس سے پہلے تو دنیا میں میرا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

جب انتخاب کے سارے مراحل طے ہوچکے تو ہمیں ایک ایسی خوبصورت بگھی میں بٹھایا گیا جس میں ہم سب کو آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔ اس بگھی نے بینڈ باجے کے ساتھ شہر کی شاہراہوں پر گشت شروع کردیا۔ وہ منظر میرے لیے آج تک ناقابل فراموش ہے، سڑکوں کے دونوں طرف لوگ کھڑے پُراشتیاق انداز میں ہمیں دیکھ رہے تھے، تالیاں بجارہے تھے اور ہم پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کررہے تھے۔ وہ بالکل کوئی فلمی سین لگ رہا تھا۔ میرا دماغ ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس دوران بارش بھی شروع ہوچکی تھی اور ہم سب لڑکیاں اس میں بھیگ رہی تھیں لیکن مجھے گویا اب اس کی بھی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔

بارش نے ماحول کو اور بھی زیادہ رومانی بنادیا تھا۔ گھر سے چلتے وقت میں ڈر رہی تھی کہ اگر بارش ہوگئی تو میرے جوتوں کی سفید پالش نہ اتر جائے اور ان کا پرانا پن ظاہر نہ ہوجائے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ بارش سے جوتوں کی پالش ذرا بھی نہیں اتری۔ مجھے پتا چلا کہ سڑکوں کے دونوں طرف کھڑے لوگوں میں کئی اداکار، اداکارائیں اور گلوکار بھی موجود تھے جو درحقیقت اٹلی کے شوبزنس کے سپر اسٹارز تھے۔ وہ بھی اپنے شہر کی حسین لڑکیوں کو داد دینے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔

بے شک میں اس روز بہت خوش تھی۔ وہ مجھے اپنی زندگی کا ایک ناقابل فراموش دن لگ رہا تھا، تاہم مجھے یہ اندازہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ دن میری زندگی کا رخ بھی تبدیل کردے گا۔ میں تو بس اتنی اہمیت اور اتنی پذیرائی ملنے پر ہی حد سے زیادہ خوش تھی۔ دوسری خوشی مجھے تحائف اور نقد رقم ملنے کی تھی۔ ہمیں تحفے کے طور پر ایسی بہت سی چیزیں ملی تھیں جن سے گھر کی آرائش کی جاسکتی تھی اور اس کی حالت بہتر بنائی جاسکتی تھی۔ وہ چیزیں دیکھ کر ماما لوئیسا کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ ان چیزوں کے علاوہ مجھے 23000 لیرا کی نقد رقم بھی ملی جو اس وقت کے 36 امریکی ڈالرز کے برابر تھی۔ میں نے اپنی اس وقت تک کی زندگی میں اتنی رقم اکٹھی نہیں دیکھی تھی۔

اس کے علاوہ ہمیں روم کے لیے ٹرین کا ٹکٹ بھی ملا جسے پاکر مما کچھ ہیجان زدہ سی ہوگئیں۔ روم ان کے خوابوں کا شہر تھا کیونکہ وہاں ''سینما سٹی'' بھی واقع تھا جو ایک طرح سے اٹلی کا ہولی وڈ تھا تاہم مما نے فوری طور پر روم کا رخ کرنے کے بجائے پہلے مجھے اداکاری سکھانے والے ایک اسکول میں داخل کرادیا۔ یہ اسکول کوئی خاص تو نہیں تھا لیکن اس کے مالک اور تربیت دینے والے واحد استاد کا دعویٰ تھا کہ اس کے ہاں سے اداکاری سیکھ کر جانے والوں میں سے کئی اس وقت اٹلی اور ہولی وڈ کے اسٹار تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کے دعوے میں کس حد تک صداقت تھی، تاہم اتنا ضرور ہوا کہ میں نے اس اسکول میں اداکاری کی چند بنیادی باتیں سیکھیں۔ سب سے بڑی یہ چیز سیکھی کہ تاثرات دینے کے سلسلے میں چہرے کے عضلات کو کس طرح استعمال کیا جائے۔ اسی اسکول میں مجھے یہ بھی پتا چلا کہ انسان کی بھنویں، تاثرات کے اظہار میں سب سے اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔ یہ باتیں آج تک میرے کام آرہی ہیں جو میں نے اس اسکول کے مالک اور ہمارے استاد ماسٹر سرپی سے سیکھی تھیں۔

اس کے کئی سال بعد، جب میں ہولی وڈ پہنچ چکی تھی اور ایک جانی پہچانی اسٹار بن چکی تھی، مجھے ایک خط ملا، جس میں لکھا تھا۔ ''میرا نام ڈی ایمور ہے۔ میں آپ کے ساتھ ماسٹر سرپی کے اسکول میں ہوا کرتا تھا اور ہم اکٹھے اداکاری کی تربیت لیا کرتے تھے۔ کیا میں آپ کو یاد ہوں؟''

اپنے لڑکپن کے اس دور کو یاد کرکے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ مجھے ڈی ایمور نامی وہ لڑکا اچھی طرح یاد تھا۔ اس کا تعلق دیہی علاقے سے تھا لیکن وہ ایک خوشحال گھرانے کا لڑکا تھا۔ اس زمانے میں خوشحالی کی سب سے بڑی نشانی تھی کہ کسی کے گھر میں کھانے پینے کی چیزیں وافر مقدار میں ہوں...... اور ڈی ایمور کے گھرانے کی خوشحالی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ماسٹر سرپی کو فیس کی ادائیگی نقد رقم کے بجائے دودھ، انڈوں اور ڈبل روٹی وغیرہ کی شکل میں کرتا تھا۔

میں جب اس ایکٹنگ اسکول میں اپنی تربیت ختم کررہی تھی تو ماسٹر سرپی نے کئی جگہوں پر میرے آڈیشن دلوائے جن کے نتیجے میں مجھے دو اطالوی فلموں میں معمولی سے رول ملے۔ ماسٹر سرپی نے اس سے بھی بڑا کام میرے لیے یہ کیا کہ مجھے پیشگی ایک اطلاع دے دی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ہولی وڈ سے ایم جی ایم والے بہت بڑے بجٹ کی ایک فلم بنانے کے لیے روم آرہے ہیں۔ روم کے نہایت قدیم اور تاریخی علاقوں میں اس کی شوٹنگ ہوگی اور ایم جی ایم والوں کو اس فلم کے لیے مقامی ایکسٹراز کی ضرورت ہوگی۔ مما نے یہ سنتے ہی مجھے ساتھ لے کر روم جانے کا فیصلہ کرلیا حالانکہ میرے نانا، نانی اب بھی اس کے حق میں نہیں تھے۔ میری بہن ماریا ابھی چھوٹی تھی اور اس کی صحت ابھی تک اچھی نہیں تھی۔ مما نے اسے نانا، نانی کے پاس ہی چھوڑ دیا اور مجھے ساتھ لے کر روم روانہ ہوگئیں۔

روم پہنچ کر میری والدہ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ریلوے اسٹیشن سے نکلتے ہی میرے والد کو فون کیا۔ انہیں بوتھ میں لگے ہوئے فون میں سکہ ڈال کر فون کرنا نہیں آتا تھا، اس لیے انہوں نے ایک کیفے میں جاکر کاؤنٹر کلرک سے درخواست کرکے وہاں کا فون استعمال کیا۔ ان کی گفتگو سے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ پاپا ان سے ملنے سے کترا رہے تھے اور وہ غیر متوقع طور پر ہمارے، روم پہنچنے کی اطلاع پاکر پریشان ہوگئے تھے۔ آخرکار مما کے اصرار پر وہ اپنی والدہ کے ہاں ہم سے ملاقات کرنے پر آمادہ ہوگئے۔

ہم جب ''نونا صوفیہ'' یعنی میری دادی کے ہاں پہنچے تو انہوں نے نہایت سردمہری سے ہمارا استقبال کیا۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ تاہم ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد میرے لیے دودھ کا ایک گلاس لے آئیں۔ مما کے لیے وہ پانی تک نہیں لائیں۔ جب پاپا کمرے میں آئے تو انہوں نے یوں بے دھیانی سے میری طرف دیکھا جیسے ان کا ذہن کہیں اور ہو۔ ان کی آنکھیں یہ بھی بتارہی تھیں کہ انہیں ہمارا آنا ناگوار گزرا ہے۔ انہوں نے اس بات پر ذرا سی حیرت یا خوشی کا بھی اظہار نہیں کیا کہ میں کتنی بڑی ہوگئی تھی۔

انہیں جب پتا چلا کہ مما مجھے ساتھ لے کر کس ارادے کے تحت روم آئی ہیں، تو وہ زور و شور سے ہمیں منع کرنے لگے کہ ہم فلمی دنیا کا رخ کرنے سے باز رہیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسی وقت ہمیں پزولی واپس روانہ کردیں۔ ہماری آمد نے شاید ان کی پُرسکون زندگی میں ہلچل برپا کردی تھی۔ وہ گزشتہ برسوں کے دوران شادی کرچکے تھے اور ان کے دو بچے تھے جن کے نام بھی مجھے معلوم تھے۔ گلیا نو اور گیپ۔ مجھے کئی سال پہلے کا وہ دن بھی اچھی طرح یاد تھا جب وہ نہایت ڈھٹائی سے مما کو اپنی شادی کی اطلاع دینے آئے تھے۔

اس سے پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مما ان کی طرف سے جو اتنی دکھی رہتی تھیں، اس کی وجہ کیا تھی اور پاپا نے ہمیشہ ہمیں کیوں دھتکارا تھا، اپنے سے دور کیوں رکھا تھا۔ جب وہ مما سے بات کررہے تھے، اسی دوران میری چھوٹی بہن سارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ پاپا نے اس کی طرف دیکھ کر حقارت آمیز انداز میں پوچھا ''یہ کون ہے؟'' حالانکہ میرے خیال میں انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ انہی کی دوسری بیٹی تھی۔

بہرحال نونا صوفیہ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی میری والدہ، میری دادی کی تمام تر سردمہری اور پاپا کی تمام تر بیگانگی اور برہمی کے باوجود کوئی ناگوار ردعمل ظاہر نہیں کررہی تھیں کیونکہ وہ پاپا سے اندھی محبت کرتی تھیں۔ وہ فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کرنے کے عزم سے دستبردار ہونے اور پزولی واپس جانے کے لیے بھی تیار نہیں تھیں۔

ہم ماں بیٹی جب نونا صوفیہ کے مکان سے باہر آئیں تو دونوں ہی افسردہ اور دل شکستہ تھیں لیکن مما کے عزم میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ انہوں نے اپنے دور پار کے ایک کزن سے رابطہ کیا۔ ہمیں رہنے کے لیے کوئی ٹھکانہ درکار تھا۔ ان کے کزن کو جب معلوم ہوا کہ وہ کس ارادے سے روم آئی ہیں تو انہوں نے بھی مما کو باز رکھنے اور ان کی حوصلہ شکنی کرنے کی پوری کوشش کی لیکن مما قسمت آزمائی کی کوشش کیے بغیر ہمت ہارنے پر تیار نہیں تھیں۔ آخرکار ان کے کزن نے ہمیں اپنے گھر میں ایک صوفے پر سونے کے لیے جگہ دے دی۔ انہوں نے پوری کوشش کی کہ ہمیں ان کے گھر میں کوئی آرام یا سہولت میسر نہ آنے پائے۔ شاید انہیں امید ہو کہ اس طرح ہم جلد اپنے مقصد کے سلسلے میں مایوس ہوکر گھر واپس چلی جائیں گی۔

(جاری ہے)

صوفیہ لورین کی داستان حیات

مجھے انگریزی کا صرف ایک لفظ آتا تھا

GRUMPIER OLD MEN

تمکین تبسم

قسط :08

دوسری صبح میں اور مما پیدل سینما سٹی کی طرف روانہ ہوئیں جو اٹلی کا ہولی وڈ تھا۔ ہم نے اس خیال سے سیاہ لباس پہنے تھے کہ شاید ان میں ہم ذرا زیادہ باعزت اور باوقار نظر آئیں۔ ہم نے دیکھا تھا کہ خوشحال طبقے کی خواتین سیاہ ملبوسات زیادہ استعمال کرتی تھیں۔ سینما سٹی بھی جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہیں رہ سکا تھا۔ اس کے کم از کم ایک سو ایکڑ رقبے پر موجود عمارتیں ملبے کا ڈھیر بن چکی تھیں، باقی عمارات میں کام جاری تھا۔ نومبر 1939ء میں بے شمار کیمرے اور فلمسازی میں استعمال ہونے والا دوسرا ساز و سامان نازی فوج کے لوگوں نے اٹھا کر ٹرین کے ذریعے جرمنی بھجوا دیا تھا حالانکہ نازی بظاہر دوسری عالمگیر جنگ میں اطالویوں کے ساتھی بن کر آئے تھے۔ فلم انڈسٹری والوں نے اپنے بہت سے کیمرے اور دیگر آلات اِدھر اُدھر چھپا کر ان کے ہاتھوں سے بچائے تھے۔

اسٹوڈیوز کی بڑی بڑی عمارتوں کو جرمن فوجیوں نے جنگ کے دوران گوداموں کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ اتحادیوں کی بمباری سے، ان میں سے سات بڑے اور اہم اسٹوڈیوز تباہ ہو گئے تھے۔ بعد میں جب اتحادی فوجیں فتح یاب ہو کر اٹلی پر قابض ہو گئیں تو روم کے اس ہولی وڈ کو مہاجر کیمپ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اتحادی فوجوں نے جب اٹلی پر اپنا تسلط ختم کرنے کا فیصلہ کیا تو سب سے پہلے روم کو آزاد کرنے کا اعلان کیا۔

روم کے آزاد ہوتے ہی بکھری ہوئی فلم انڈسٹری کے لوگ دوبارہ جمع ہونے لگے۔ انہوں نے اپنا بچا کھچا منتشر سامان جمع کیا اور دوبارہ فلمسازی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بمباری سے متاثر ہونے والے اسٹوڈیوز میں ایک ایسا بھی تھا جس میں کوئی بھی فلم شروع سے آخر تک بنائی جا سکتی تھی۔ کسی بھی قسم کی کہانی پر مبنی فلم کی شوٹنگ کے لیے باہر کہیں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ سب سے پہلے یہی اسٹوڈیو بنا تھا۔ اس کے بعد اسٹوڈیوز بنتے چلے گئے تھے اور اس علاقے نے رفتہ رفتہ سینما سٹی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ اسٹوڈیو گویا اس فلمی دنیا کی بنیاد تھا۔ جنگ بندی کے صرف ایک ماہ بعد ہی یہاں سے فلم "روم...... اوپن سٹی" (Rome, Open City) بن کر ریلیز بھی ہو گئی۔

اس وقت وسائل کی شدید کمی تھی۔ سب کچھ تقریباً تباہ ہو چکا تھا۔ لوگوں کو گویا خالی ہاتھ نئے سرے سے جدوجہد کا آغاز کرنا تھا تاہم فلمی دنیا والوں کے پاس آئیڈیاز اور جوش، ولولے کی کمی نہیں تھی۔ اس دور میں شروع ہونے والی فلمسازی، زمانہ جنگ سے پہلے کی فلمسازی سے کافی مختلف تھی۔ فلموں میں سب سے بڑی تبدیلی یہ آئی کہ ان میں بے پناہ حقیقت پسندی آ گئی۔ گلی کوچوں میں موجود لوگ، ان کے حالات، کیفیات اور اصل تاثرات فلموں میں نظر آنے لگے۔ ڈائریکٹرز فرضی کہانیوں سے زیادہ، حقائق پر مبنی کہانیوں کو ترجیح دینے لگے۔ دوسری تبدیلی فلمی شائقین کے ذوق میں بھی آئی۔ حقیقت پسندانہ فلموں کے ساتھ ساتھ ان میں امریکی فلمیں دیکھنے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ اٹلی میں امریکی افواج کی آمد کے ساتھ ہی امریکی فلموں کا بھی سیلاب آ گیا تھا۔ ان فلموں میں انسانی آزادی اور امید کا تاثر ضرور ملتا تھا۔ اطالوی شاید اس لیے بھی ان فلموں کو پسند کرنے لگے تھے کہ یہ ان کی آنکھوں میں نئے خواب سجاتی تھیں۔

دوسری طرف یہ بھی ہوا کہ ان فلموں نے اطالوی فلمسازوں اور بڑے بڑے امریکی اسٹوڈیوز کے درمیان مقابلے اور مسابقت...... بلکہ کسی حد تک رقابت کی فضا بھی پیدا کر دی۔ اس وقت ہمارے اسٹیٹ انڈر سیکرٹری نوجوان تھے جو آگے چل کر ملک کے 41 ویں وزیراعظم بھی بنے۔ وہ اس زمانے میں اطالوی فلم انڈسٹری کے لیے بہت فکرمند تھے۔ ان کی پوری کوشش تھی کہ جنگ سے تباہ شدہ اطالوی فلم انڈسٹری دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔ انہوں نے امریکی فلموں سے ہونے والی آمدنی اٹلی سے باہر لے جانے پر پابندی لگا دی تھی۔ پھر جب ہولی وڈ کے ایم جی ایم اسٹوڈیوز والے ایک فلم بنانے کے لیے روم پہنچے تو ایسا لگا جیسے ہولی وڈ ہی خود چل کر روم آ گیا ہو۔ اس فلم کا اطالوی نام Quo Vadis تھا۔

درحقیقت یہیں سے میری فلمی زندگی کی کہانی شروع ہوتی ہے!

وہ مئی 1950ء کی ایک صبح تھی جب میں اور مما ایک بار پھر فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کے لیے ایک چھوٹی بس میں سوار ہو کر سینما سٹی پہنچے جو اس کا آخری اسٹاپ تھا۔ سینما سٹی کے سامنے نہ جانے کتنے رومن فوجیوں نے ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ وہ بھی ایکسٹرا کے طور پر کام حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ دوسرے ہزاروں افراد بھی قطاروں میں کھڑے ہوئے تھے۔ وہ سب اسی انتظار میں تھے کہ شاید انہیں کسی فلم میں ایکسٹرا کے طور پر کام مل جائے۔ میں اور مما بھی دلوں میں ہزاروں امیدیں لیے ایک لمبی قطار میں لگ گئے۔ ایم جی ایم کا کوئی چھوٹا موٹا ملازم سب کے نام نوٹ کر رہا تھا۔ ان قطاروں میں عورتیں اور لڑکیاں بھی شاید ہزاروں کی تعداد میں تھیں۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔

آخرکار فلم کا ڈائریکٹر "مروِن لی رائے" وہاں پہنچا اور ایکسٹرا کے طور پر کام کرنے کے امیدواروں کو "ملاحظے" کے لیے قطار در قطار اس کے سامنے سے گزارا جانے لگا۔ وہ اپنی پسند کے چہرے منتخب کر رہا تھا۔ میں جب اس کے سامنے پہنچی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اسے صرف انگریزی بولنی آتی تھی اور مجھے انگریزی نہیں آتی تھی۔ مجھے مما نے انگریزی کا صرف ایک لفظ سکھایا تھا اور وہ تھا "یس......"

چنانچہ جب مروِن لی رائے نے مجھ سے پوچھا "کیا تمہیں انگریزی بولنی آتی ہے؟"

تو میں نے جواب دیا "یس"۔

"کیا تم پہلی بار سینما سٹی آئی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"یس" میں نے جواب دیا۔

"کیا تم نے وہ ناول پڑھا ہے جس پر یہ فلم بنائی جا رہی ہے؟"

"یس"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"یس"

آسکر ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد

"تمہاری عمر کیا ہے؟"

"یس"

مروِن لی رائے بے اختیار ہنسنے لگا۔ شاید اسے میری معصومیت یا ناتجربہ کاری اچھی لگی۔ اس نے مجھے نہایت مختصر سا ایک کردار دے دیا جس میں مجھے کچھ بولنا نہیں تھا۔ مجھے فلم کے مرکزی کردار کے فتح یاب ہو کر واپس آنے کے سین میں اس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کرنی تھیں۔ مرکزی کردار ہولی وڈ کے اس زمانے کے وجیہہ ہیرو رابرٹ ٹیلر نے ادا کیا تھا۔ مما بھی فلم میں ایکسٹرا کے طور پر کام کے دوران پورا دن اپنے سر پر تانبے کی ایک وزنی باسکٹ اٹھائے پھرتی رہیں جس کے نتیجے میں ان کی گردن اکڑ گئی۔ رات کو ان سے اپنی گردن ذرا بھی اِدھر اُدھر موڑی نہیں جا رہی تھی۔ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ اس باسکٹ کا وزن دیکھ کر اسی اندیشے کے تحت کسی اور عورت نے یہ کردار قبول ہی نہیں کیا تھا کہ دن بھر اسے اٹھا کر پھرنے سے کہیں گردن نہ اکڑ جائے۔

مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے جب میں نے ایکسٹرا کے طور پر پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تھا۔ وہ سین ایک بڑے ہجوم پر فلمایا گیا تھا اور سارا دن اس کی شوٹنگ چلتی رہی تھی۔ وہ شور شرابا، وہ افراتفری، مختلف لوگوں کا چیخ چیخ کر ہدایات دینا، وہ حبس اور گرمی، سیکڑوں لوگوں کی وہ نقل و حرکت...... یہ سب کچھ مجھے آج بھی اس طرح یاد ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ اس تجربے سے مجھے کم عمری میں ہی معلوم ہو گیا کہ فلموں کے وہ مناظر، جنہیں ہم شاندار سینما گھروں میں آرام سے بیٹھ کر...... اور بعض اوقات بے توجہی سے دیکھتے ہیں، وہ کتنی مشکلوں سے پکچرائز ہوتے ہیں۔

مجھے یہ بھی پتا چلا کہ فلمی دنیا میں ایکسٹراز کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا۔ انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر ایک لوکیشن سے دوسری لوکیشن پر لے جایا جاتا ہے اور اگر ان کی وجہ سے کوئی گڑبڑ ہو جائے اور شاٹ دوبارہ لینا پڑے، تب تو انہیں بہت کچھ سننا پڑتا ہے۔ میں اس روز جب بھی ایکسٹراز کی اگلی صف میں کھڑی ہوتی تو مجھے امید ہوتی کہ میں سین میں اچھی خاصی نمایاں نظر آؤں گی لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں اس بھیڑ بھاڑ میں محض ایک چھوٹا سا چہرہ تھی۔ یہ چہرہ بھی زیادہ تر دھندلایا ہوا تھا۔ اس کے باوجود میں اس روز بہت مطمئن تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جہاں میں پہنچنا چاہتی تھی، وہاں پہنچ گئی ہوں اور اگر میں نے صبر و استقامت سے اپنی جدوجہد جاری رکھی تو اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاؤں گی۔

ایکسٹراز میں کارلو پیڈرسولی نامی ایک اطالوی نوجوان بھی شامل تھا جو آگے چل کر بڈ اسپنسر کے نام سے ہولی وڈ کا سپر اسٹار بنا۔ جس وقت وہ ایکسٹرا کے طور پر کام کر رہا تھا، ان دنوں وہ تیراکی میں اٹلی کا چیمپئن تھا۔ اس کے ورزشی جسم کی وجہ سے اسے فلم میں رومن فوجی دکھایا گیا تھا۔ الزبتھ ٹیلر کو بھی اس فلم میں ایک مختصر سا کردار ملا تھا حالانکہ وہ اس وقت نوجوان ہونے کے باوجود ہولی وڈ میں خاصا نام بنا چکی تھی۔ وہ مجھ سے چند سال بڑی تھی اور اس کی فلم Lassie Come Home نے اسے اسٹار بنا دیا تھا۔ میں رابرٹ ٹیلر اور ڈیبورا کیر کو حقیقت میں اپنے سامنے دیکھ کر چند لمحوں کے لیے تو دم بخود رہ گئی۔ میں ان کی کئی فلمیں دیکھ چکی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ جن اداکاروں کو میں سینما کی اسکرین پر دیکھ کر ہی سحرزدہ ہو جاتی تھی، وہ اس وقت سچ مچ میرے سامنے موجود ہیں۔

خیر...... یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں، ابھی تو اس سے پہلے کی بھی کچھ باتیں بتانا باقی ہیں۔ گلاب کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ سینما سٹی پہنچ کر مجھے بھی ایک کانٹا چبھنا تھا۔ ڈائریکٹر نے جب چہرے دیکھ کر ایکسٹراز کے طور پر امیدواروں کو منتخب کر لیا تو پھر لاؤڈ اسپیکر پر ان کے نام پکارے جانے لگے تاکہ وہ ایک طرف ہو جائیں۔ ان میں سے ہر ایک کا نام اور دیگر کوائف وغیرہ ایک فارم میں درج ہونا تھے تاکہ ریکارڈ رہے اور انہیں ان کے کام کے حساب سے معاوضہ بھی ملتا رہے۔

جب میرا نام میرے خاندانی نام "سکولون" کے ساتھ پکارا گیا جو مجھے میرے والد کی طرف سے ملا تھا، تو میں اس طرف چلی گئی جس طرف منتخب امیدوار جمع ہو رہے تھے۔ چند لمحے بعد یہی خاندانی نام کسی اور لڑکی یا عورت کے نام کے ساتھ لگا کر پکارا گیا۔ میں ذرا حیران ہوئی کہ وہاں دوسری "سکولون" کون آ گئی؟ پھر مجھے پتا چلا کہ وہ میرے والد کی بیوی تھی۔ وہ عورت، جس سے انہوں نے باقاعدہ شادی کی تھی۔ وہ مجھے اور مما کو وہاں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئی لیکن اس موقع پر قدرت نے میری مدد کی۔ فلم کمپنی کے آدمی نے مجھے رکھ لیا اور اسے رخصت کر دیا۔ میں اپنی کم عمری کے باوجود پاپا کے اس دوغلے رویے پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکی کہ انہوں نے مجھے تو فلمی دنیا کا رخ کرنے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن اپنی "باقاعدہ" اور "باضابطہ" بیوی کو یہاں آنے سے نہیں روکا تھا۔

(جاری ہے)

صوفیہ لورین کی داستان حیات

صرف میری خوبصورتی نہیں، میرے حالات کی بدصورتی بھی اسے نظر آگئی

قسط : 09

بہر حال...... اس سین میں بطور ایکسٹراز، کام کرنے ...... یا پھر یوں کہیے کہ تجل خوار ہونے کا معاوضہ ہمیں پچاس ہزار لیرے ملا جو اُس وقت کے 80 ڈالر کے برابر تھے۔ اس رقم سے ہم نے دو ہفتے کا کھانے پینے کا سامان خرید لیا...... لیکن ہوا یہ کہ جونہی رقم ختم ہوئی، مما کی امیدیں بھی دم توڑ گئیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ اس دوران میرے ذہن میں پلتے ہوئے دھندلے خواب کچھ اور واضح ہونے لگے تھے۔ امیدوں کے رنگ کچھ گہرے ہونے لگے تھے۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مما......؟'' میں نے حیرت سے کہا ''ابھی ہمیں یہیں رہنا چاہیے اور مزید قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔''

مما نے میری آنکھوں میں جھانکا اور تب شاید انہیں اندازہ ہوگیا کہ جو خواب کبھی وہ دیکھا کرتی تھیں، وہ اب میری آنکھوں میں منتقل ہوگیا ہے۔ مما نے واپس جانے کا ارادہ ملتوی کردیا لیکن پھر جلد ہی وہ جانے پر مجبور ہوگئیں کیونکہ گھر سے خبر آئی تھی کہ ماریا زیادہ بیمار ہوگئی ہے۔ مما نے مجھے وہیں چھوڑا اور خود عجلت میں پزولی روانہ ہو گئیں۔ ان کے جانے کے بعد میں اس گھر میں اور بھی زیادہ محتاط انداز میں رہنے لگی۔ ماما لوئیسا کی تربیت نے مجھے نہایت نظم وضبط سے رہنا اور اپنے برے بھلے کی تمیز سکھا دی تھی۔ میں سب کے سوجانے کے بعد سوتی اور صبح سب سے پہلے اٹھ جاتی۔ اپنے مختصر سے سامان کو سمیٹ کر رکھتی۔ صفائی ستھرائی کا خیال رکھتی، گھر میں موجود افراد کے کام خود آگے بڑھ بڑھ کر کرنے کی کوشش کرتی اور احتیاط کی بھی پوری کوشش کرتی کہ کسی کو مجھ سے شکایت کا موقع نہ ملے۔ مجھے اپنی کم عمری کے باوجود یہ بھی شعور تھا کہ اپنے آپ کو کسی بھی قسم کے جال میں پھنسنے سے بچانا ہے۔

اسی دوران مجھے یہ خوشخبری بھی ملی کہ فلم میں ایکسٹرا کے طور پر کام کرنے کے دوران میں ایک رسالے ''فوٹو رومانس'' کے ایڈیٹر کی نظر میں بھی آچکی ہوں۔ یہ اس زمانے میں اٹلی کا ایک نہایت مقبول رسالہ تھا جس میں عشق، محبت، رقابت اور دیگر انسانی جذبات پر مبنی تصویری کہانیاں شائع ہوتی تھیں جن کے لیے منتخب لوگ ماڈلنگ کرتے تھے۔ انہی کی تصاویر اور مناظر کی مدد سے یہ کہانیاں بیان کی جاتی تھیں۔ اس کی کسی تصویری کہانی کے ساتھ ساتھ اس کے ٹائٹل پر بھی چھپنا کسی لڑکی کے لیے اچھا خاصا اعزاز ہوتا تھا۔ ملک کے مختلف طبقات کی، اس رسالے کے بارے میں مختلف آراء تھیں۔ کوئی اسے قوم کے لیے افیون قرار دیتا تھا، کوئی اسے تھرڈ کلاس ادب کہتا تھا اور کوئی اسے سستی تفریح کا نام دیتا تھا۔

اس میں تصویری کہانیاں قسط وار بھی شائع ہوتی تھیں جن میں ''کام'' کرنے کا معاوضہ بھی ملتا تھا۔ یہ بھی فلم میں کام کرنے سے کچھ کچھ ملتا جلتا کام تھا۔ مجھے اس میں کام مل گیا تو گویا روم میں میرے مزید قیام کرنے کا وسیلہ پیدا ہوگیا۔ یہ کام مجھے دلچسپ بھی لگتا تھا اور اس کی وجہ سے میری کچھ نئے نئے لوگوں سے ملاقات بھی ہوتی تھی جن میں سے بعض میرے چھوٹے موٹے مسائل کے حل کے سلسلے میں مددگار بھی ثابت ہوتے تھے۔ کیمرے کے سامنے کام کرنے کا میرا تجربہ بھی بڑھ رہا تھا۔ جنگ کے دوران ہم نے بہت برا وقت گزارا تھا۔ اب اس مصروفیت میں گویا وقت بہت اچھا گزرنے لگا۔

اس میگزین میں پیش کی جانے والی تصویری کہانیاں زیادہ تر فلمی انداز کی ہی ہوتی تھیں اور مجھ سمیت کئی لڑکیاں ان میں مختلف کردار ادا کرتی تھیں۔ بعض کہانیوں میں ادبی اور افسانوی رنگ بھی جھلکتا تھا۔ کئی لڑکیاں گویا اس میگزین کی ''اسٹارز'' تھیں۔ میں بھی ان میں شمار ہونے لگی۔ میگزین کی ایک خاتون ایڈیٹر نے میرے نام ''صوفیہ سکولون'' کو تھوڑا سا بدل کر صوفیہ لزارو رکھ دیا تھا۔ بہت سے لوگ میگزین کی معرفت ہمیں خط بھی لکھتے تھے اور ہماری طرف سے بعض خطوط کے جوابات بھی چھپتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں، کون لوگ خطوط لکھتے تھے اور کون ہماری طرف سے جوابات لکھتا تھا۔

میں نے اس دوران سینما سٹی کے چکر لگانے کا سلسلہ بھی جاری رکھا جہاں مجھے بہت سی فلموں میں ایکسٹرا کے طور پر کام ملا۔ ان میں سے بعض تو اس وقت بڑے مشہور ڈائریکٹرز کی بنائی ہوئی تھیں۔ کسی کسی فلم میں مجھے ایک آدھ مکالمہ بولنے کا موقع بھی مل جاتا۔ مما اس دوران ماریا کو ساتھ لے کر دوبارہ روم آچکی تھیں۔ وہ میری تمام مصروفیات میں میرے ساتھ رہتیں۔ میں نے ایک اسٹیج ڈرامے میں بھی کام کیا۔ مما نے اس ڈرامے میں اسٹیج پر پیانو بجایا۔ شوبز کی دنیا میں کوئی مقام حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں تو میں ہی مار رہی تھی لیکن مما ایک سہارے کے طور پر میرے ساتھ تھیں۔

دھیرے دھیرے مجھے شوبز کی دنیا کی کچھ سمجھ بھی آرہی تھی اور میں شوبز کے لوگوں کی نظر میں بھی آنے لگی تھی۔ چھوٹے موٹے کرداروں کے لیے مجھے بلاوے بھی آنے لگے تھے اور ''فوٹو رومانس'' کے علاوہ دیگر رسائل اور اخبارات میں بھی کبھی کبھار میری تصویریں چھپنے لگی تھیں۔ آخر کار 1953ء میں پہلی بار مجھے فلم Aida میں مرکزی کردار ملا۔ یہ ایک اطالوی نغماتی قسم کے المیہ اسٹیج ڈرامے سے متاثر ہو کر بنائی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے Two Nights With Cleopatra میں بھی مرکزی کردار ملا۔ یہ دونوں فلمیں مجھے ''فوٹو رومانس'' میں چھپنے والی میری تصویری کہانیوں کی وجہ سے مجھے ملی تھیں۔ تب مجھے یقین سا آنے لگا کہ میں واقعی اداکارہ بن گئی ہوں۔

اپنی فلمی مصروفیات کی وجہ سے میرا ''فوٹو رومانس'' کے لیے کام کرنے کا سلسلہ منقطع ہوگیا جس پر رسالے والوں نے میری ایک نہایت افسانوی انداز کی تصویر اس عبارت کے ساتھ شائع کی ''ہماری بہت سی تصویری کہانیوں میں اپنے حسن اور تاثرات سے جان ڈالنے والی ہماری اسٹار صوفیہ لزارو...... جسے فلم والے ہم سے چھین کر لے گئے۔''

اس طرح، جدوجہد سے بھرپور میری زندگی کا یہ ایک باب اختتام کو پہنچ گیا لیکن میں کچھ اہم باتیں بتانے کے لیے اس سے ذرا پیچھے کے دور میں چلتی ہوں۔

وہ ستمبر 1951ء کی ایک شام تھی اور روم میں ایک مقابلۂ حسن منعقد ہو رہا تھا جو غالباً ''مس روم'' کے ٹائٹل کے لیے تھا۔ میں اس قسم کے نہ جانے کتنے مقابلوں میں حصہ لے چکی تھی اور ہمیشہ دوسرے نمبر پر آتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ دوسرا نمبر مستقل طور پر میرے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا۔ بہر حال اس شام میں صرف اور صرف تفریح کے لیے اس مقابلے میں حصہ لے رہی تھی اور ایک بوتیک کی مالکن نے کسی شناسا خاتون کی سفارش پر ازراہ مہربانی مجھے مقابلے اور اس کے بعد کی تقریب میں شرکت کے لیے لباس مستعار دے دیا تھا۔ میں نے اس کا بہت زیادہ شکریہ ادا کیا اور اس سے بھی زیادہ میں دل ہی دل میں اس کی شکر گزار تھی۔ میں اس بات پر ہمیشہ دل ہی دل میں اپنے رب کا بھی بہت شکر ادا کرتی تھی کہ اس نے ہر دور میں ایسے لوگ ضرور پیدا کیے تھے جو کسی غرض کے بغیر دوسروں کے کام آتے تھے۔

اس مقابلۂ حسن کے لیے ہم لڑکیوں کو تیار کرانے اور ہماری رہنمائی کرنے والی تین خواتین 1947ء کے مقابلۂ حسن کے فائنل میں پہنچی تھیں۔ ان میں اپنے وقت کی مشہور اداکارہ جینا لولو بریجیڈا بھی شامل تھی۔ مقابلۂ حسن کے دوران جب میں نے جیوری کے سامنے پریڈ میں حصہ لیا تو ان کے لیے گویا میرے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ وہ مجھے کس قسم کی حسین لڑکیوں میں شمار کریں۔ میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ ان کی نظر میں میری خوبصورتی اور جسمانی ساخت کچھ عجیب سی تھی۔ میں نے آج تک حسن کے جتنے مقابلوں میں حصہ لیا تھا، ان سب میں ججوں کی اس الجھن کو محسوس کیا تھا۔ وہ مجھے حسین تو شمار کرتے تھے لیکن انہیں میرا حسن کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ آخر کار اس تازہ ترین مقابلے میں ججوں نے میرے لیے موقعے پر ہی ایک علیحدہ کیٹگری تخلیق کی اور مجھے ''مس ایلی گینس'' (Miss Elegance) قرار دیا گیا۔

مقابلے کی کارروائیاں ختم ہونے کے بعد میں اسی عمارت میں نچلی منزل پر واقع ریسٹورنٹ میں اپنی دوست لڑکیوں کے ساتھ پارٹی سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ ویٹر ایک چٹ لے کر آیا جس پر لکھا تھا ''مقابلۂ حسن میں حصہ لینے والی تمام لڑکیوں کو میں نے بغور دیکھا تھا۔ آپ خاص طور پر میری نظر میں آئی ہیں۔ اب ان لڑکیوں کی بالائی منزل پر تصویریں اور فلم بن رہی ہے۔ اگر آپ بھی ان میں شامل ہوجائیں تو مجھے خوشی ہوگی...... کارلو پونٹی۔''

مجھے نہیں معلوم تھا کہ کارلو پونٹی کون تھا۔ میں نے اس چٹ کو پھاڑ کر پھینکنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا اس وقت کہیں جانے اور تصویریں یا فلم بنوانے کا قطعی موڈ نہیں ہے۔ میں اب صرف تھوڑی سی تفریح کرنا چاہتی ہوں۔''

تاہم میری میز پر موجود لڑکیوں نے مجھے سمجھایا کہ اس فرمائش کو رد کرنا عقلمندی نہیں تھی کیونکہ کارلو پونٹی اٹلی کا ایک کامیاب فلم پروڈیوسر تھا اور میں یقیناً اس کی نظر میں آگئی تھی۔ وہ شاید زیادہ سے زیادہ تصویروں اور فلم میں میری ''اسکرین بیوٹی'' دیکھنا چاہتا تھا اور اس کی یہ فرمائش میرے لیے کسی بڑی کامیابی کا پیش خیمہ ہوسکتی ہے۔ ان کے سمجھانے پر میں دوبارہ جا کر تصویریں اور فلم بنوانے والی لڑکیوں میں شامل ہوگئی۔ ویسے تو مقابلۂ حسن کے دوران بھی ہماری بہت سی تصویریں اور فلم بنی تھی لیکن اس وقت یہ کام جلدی جلدی ہو رہا تھا۔ اب فوٹو گرافر اور کیمرا مین اطمینان سے یہ کام دوبارہ کر رہے تھے۔

جب فوٹو گرافر اور کیمرا مین اپنے کام سے فارغ ہو کر اِدھر اُدھر ہوگئے تو چھوٹے قد کا ایک قدرے گول مٹول سا آدمی میرے پاس آیا اور اس نے کارلو پونٹی کے نام سے اپنا تعارف کرایا۔ مجھ سے اس پہلی ملاقات کے وقت کارلو کی عمر 39 سال اور میری 17 سال تھی۔ یعنی وہ مجھ سے 22 سال بڑا تھا۔ وہ ایک کامیاب فلمساز کے طور پر خاصا نامور آدمی تھا۔ یہ میری کم علمی تھی کہ میں اسے نہیں جانتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ کئی لڑکیاں جو اب مشہور فلم اسٹارز تھیں، انہیں اسی نے متعارف کرایا تھا اور حسن کے مقابلوں کے دوران ہی اس کی نگاہ انتخاب ان پر پڑی تھی۔ ان میں جینا لولو بریجیڈا کے علاوہ لوسیا بوس بھی شامل تھی۔ لوسیا ایک فلم اسٹار، سپر ماڈل اور میری آئیڈیل تھی۔ میں درحقیقت ان دنوں لباس اور انداز و اطوار میں اسی کی نقل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

''آیئے...... ذرا قریبی پارک میں چہل قدمی کرتے ہوئے بات چیت کرتے ہیں......'' کارلو نے میری خوبصورت شال میرے کندھوں پر ڈالتے ہوئے کہا۔ یہ شال بھی لباس کے ساتھ مجھے بوتیک سے مستعار ملی تھی۔ کارلو نے بات جاری رکھتے ہوئے بتایا۔ ''اس پارک کو روز گارڈن کہا جاتا ہے۔ وہاں ہر وقت ہوا میں گلابوں کی مہک رچی رہتی ہے جو بہت ہی اچھی لگتی ہے۔''

(جاری ہے)

صوفیہ لورین کی کہانی ان کی زبانی

شوہر کارلو پونٹی کے ساتھ

اُس نے کہا

”تمہارا چہرہ غیر معمولی ہے“

تمکین تبسم

قسط : 10

میں اس کے ساتھ جانے کے لیے تو اٹھ کھڑی ہوئی لیکن دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ شاید آج بھی میری ملاقات اسی قسم کے ایک، پکی عمر کے آدمی سے ہو رہی ہے جو کہیں بھی کسی نوجوان اور حسین لڑکی کو دیکھ کر کسی نہ کسی بہانے اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر یہ بھی اسی قسم کا آدمی نکلا تو اس کا ذرا بھی لحاظ کیے بغیر اسے واپسی کا راستہ دکھا دوں گی۔ مجھے اپنی جدوجہد کے دوران ایسے بہت سے ”ٹھرکی“ قسم کے مردوں سے پالا پڑا تھا لیکن میں ہمیشہ اپنے آپ کو ان کے جال سے بچانے میں کامیاب رہی تھی۔

میرا خدشہ بالکل غلط ثابت ہوا۔ کارلو مجھ سے ملاقات کے دوران زیادہ تر کام کی باتیں کرتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں وہ ہوس، وہ منفی سی دلچسپی یا طلب بالکل نہیں تھی جو مجھے اس سے پہلے بہت سے مردوں کی آنکھوں میں نظر آ چکی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے اس پر اعتماد سا ہو گیا اور میں اس سے اس طرح باتیں کرنے لگی، جیسے میں اسے بہت عرصے سے جانتی ہوں۔ اس نے مجھے ان فلموں کے بارے میں بتایا جو وہ ان دنوں بنا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے میرے مستقبل کے ارادوں کے بارے میں پوچھا اور یہ بھی پوچھا کہ میں کہاں سے آئی ہوں۔

جب میں نے اسے بتایا کہ میں پزولی سے آئی ہوں، تو وہ بولا۔ ”اچھا......؟ بڑا خوبصورت قصبہ ہے۔ میں چند سال پہلے وہاں گیا تھا۔ وہاں ایک بہت اچھا سنیما بھی ہے......“

اس نے سنیما کا نام لیا تو میں نے ذرا جوش سے کہا۔ ”وہ تو ہمارے گھر کے پیچھے ہی ہے۔ ہماری کھڑکی سے نظر آتا ہے۔“

مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ یہ شخص میری فطرت، میرے مزاج اور میری شخصیت کو ہی نہیں، بلکہ میرے مسائل کو بھی سمجھ گیا ہے۔ وہ یہ بھی جان گیا ہے کہ میں نے اب تک کوئی آسان اور پُر آسائش زندگی نہیں گزاری۔ ان معاملات کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال کیے بغیر اسے میرے ماضی، میرے حالات اور میرے مسائل کا اندازہ ہو چکا ہے۔ وہ صرف میری ظاہری خوبصورتی کو ہی نہیں بلکہ اس کے پیچھے چھپے ہوئے بدصورت حقائق کو بھی دیکھ رہا ہے۔ اسے یہ بھی اندازہ ہو چکا ہے کہ میں اپنی بے وقعتی سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہوں، میں کچھ بننا چاہتی ہوں، کوئی مقام حاصل کرنا چاہتی ہوں۔

شاید اسی لیے وہ اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم نے کبھی اسکرین ٹیسٹ دیا ہے؟“

”وہ...... بات دراصل یہ ہے کہ......“ میں ذرا گڑبڑا گئی اور بات مکمل نہ کر سکی۔ مجھے یہ اعتراف کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ مجھے آج تک کسی نے باقاعدہ طور پر اسکرین ٹیسٹ کے لیے بلایا ہی نہیں تھا۔

کارلو نے مجھے بات مکمل کرنے کا موقع بھی نہیں دیا اور جلدی سے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے کہ تمہارے چہرے میں کوئی غیر معمولی بات ہے۔ تم کل مجھ سے میرے آفس میں ملو۔ میں تمہارے اسکرین ٹیسٹ کا انتظام کراتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اسکرین پر کیسی نظر آتی ہو۔“

اس نے مجھے اپنے آفس کا ایڈریس دیا اور خوش خلقی سے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔ کئی منٹ کی اس ملاقات میں اس نے کوئی سطحی بات نہیں کی تھی اور اس کے طرز عمل سے مجھے ذرا بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ فلموں میں کام کرنے کی جو لگن اور خواہش مجھ میں موجود تھی، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنا کوئی مقصد پورا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ساری گفتگو نرمی اور اخلاق سے کی تھی جیسے میں شوبز کے میدان میں ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی کوئی نوعمر اور ناتجربہ کار لڑکی نہیں بلکہ اس کے برابر کی انسان ہوں۔ اس نے ذرا بھی عامیانہ پن کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ شاید اس نے مجھ میں کوئی غیر معمولی چیز محسوس کی تھی، تبھی خود پہل کر کے اتنی اچھی طرح مجھ سے ملا تھا ورنہ اس کی تو روز ہی نہ جانے کتنی حسین لڑکیوں سے ملاقاتیں ہوتی ہوں گی۔

دوسرے روز میں ہانپتی کانپتی کارلو کے دیے ہوئے ایڈریس پر پہنچی تو حیران رہ گئی۔ میرے سامنے کسی آفس کے بجائے پولیس اسٹیشن تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں کارلو بھی ان لوگوں میں تو نہیں تھا جو نہایت سنجیدگی سے لڑکیوں سے شرارتیں کرتے ہیں اور انہیں بے وقوف بناتے ہیں؟ وہ پروڈیوسر تھا بھی یا نہیں؟ مگر اس دوران ایک نوجوان پولیس مین غالباً میرے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر میرے قریب آیا اور میرے کچھ کہے بغیر ہی میری الجھن کو سمجھتے ہوئے بولا۔ ”آپ شاید کارلو پونٹی کا دفتر تلاش کر رہی ہیں...... وہ برابر میں ہے......“

اس نے ایک طرف اشارہ کیا تو میں نے دیکھا کہ پولیس اسٹیشن کے زیر سایہ ایک دروازہ نظر آ رہا تھا جو کسی آفس کا ہی معلوم ہوتا تھا مگر اس پر کوئی تختی یا بورڈ وغیرہ موجود نہیں تھا۔

میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں پولیس مین کا شکریہ ادا کیا اور اس دروازے میں داخل ہو گئی۔ اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اطالوی فلمی دنیا کے مرکز میں داخل ہو رہی ہوں۔ میری عمر اس وقت سترہ سال سے بھی چند دن کم تھی۔

اندر پہنچ کر مجھے ایک شاندار اور کشادہ لابی میں تقریباً آدھا گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ کارلو کچھ لوگوں سے ملاقات میں مصروف تھا۔ میں اس دوران اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ باہر سے بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ دفتر اندر سے اتنا شاندار اور طویل و عریض ہو گا اور نہ یہ پتا چلتا تھا کہ یہاں اتنے لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہو گی۔ پھر جب کارلو نے مجھے اپنے کمرے میں بلوایا تو مجھے مزید حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے آج تک اتنا شاندار آفس نہیں دیکھا تھا۔ اس کی بڑی سی میز پر مختلف رنگوں کے نہ جانے کتنے ٹیلیفونوں کی ایک لمبی لائن تھی۔

اس نے جب دیکھا کہ میں حیرت سے اتنے بہت سے ٹیلیفونوں کو دیکھ رہی ہوں، تو بتایا۔ ”یہ مختلف براعظموں کے لیے الگ الگ لائن کے ٹیلیفون ہیں۔“

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس سے کیا بات کروں اور نہ ہی وہ مجھ سے کچھ پوچھ رہا تھا تاہم میں اس کے سامنے اب کسی قسم کی گھبراہٹ یا اضطراب محسوس نہیں کر رہی تھی۔ میں بالکل پُرسکون اور پُراعتماد تھی۔ کارلو یقیناً ایک تجربہ کار اور جہاندیدہ شخص تھا۔ میں اس کے سامنے زندگی کے ہر معاملے میں ایک ناتجربہ کار اور اناڑی لڑکی تھی لیکن ایسا لگتا تھا کہ اس کا تجربہ اور میرا اناڑی پن بیچ راستے میں کہیں گلے مل رہے تھے۔ اتنی سی دیر میں مجھے ایسا لگنے لگا تھا جیسے میں کارلو کو خاصے طویل عرصے سے جانتی ہوں اور شاید وہ بھی مجھے اجنبی محسوس نہیں کر رہا تھا۔

چند لمحے کی گفتگو کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ ایک قریبی سنیما ہاؤس میں لے گیا جس کی طویل و عریض حدود میں ایک جگہ اس کی کسی فلم کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ وہاں کارلو نے گویا مجھے ایک کیمرا مین کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔ ”اس لڑکی کا اسکرین ٹیسٹ لینا ہے۔“

اس نے سر ہلایا اور ایک طرف چلا گیا۔ چند لمحے بعد ایک شخص میرے پاس آیا اور ایک سوئمنگ سوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لو...... اسے پہن لو۔“

اس کا لہجہ نرمی اور شائستگی سے بالکل عاری تھا۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی کہ پروڈیوسر میرے ساتھ تھا، اس کے باوجود وہ مجھ سے ایسے غیر مہذبانہ لہجے میں بات کر رہا تھا، اگر میں خود اپنے طور پر براہ راست ان لوگوں کے پاس آئی ہوتی تو نہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ بہرحال میں وہ سوئمنگ سوٹ لے کر، فولڈ ہونے والے ایک پارٹیشن کے پیچھے چلی گئی۔ میں نے وہ سوئمنگ سوٹ پہن تو لیا لیکن سچی بات یہ ہے کہ جب میں پارٹیشن کے پیچھے سے نکل کر کارلو پونٹی اور دوسرے لوگوں کے سامنے آئی تو مجھے بہت شرم آ رہی تھی حالانکہ ہمارے معاشرے میں، اس وقت بھی سوئمنگ سوٹ پہننا یا سوئمنگ سوٹ پہن کر لوگوں کے سامنے آنا قطعی کوئی معیوب بات نہیں تھی مگر مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے میرے جسم پر کوئی لباس ہی نہیں ہے۔

تاہم مجھے یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ وہاں موجود لوگوں نے ذرا بھی عجیب نظروں سے میری طرف نہیں دیکھا اور نہ ہی ان کے تاثرات میں کوئی تبدیلی آئی۔ لڑکیوں کو سوئمنگ سوٹ میں دیکھنا شاید ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کیمرا مین نے ایک سگریٹ سلگا کر مجھے دی اور کہا۔ ”اس کے کش لیتے ہوئے اور کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے اس طرح ٹہلتی ہوئی آگے آؤ اور پھر پیچھے جاؤ جیسے تم پریشان ہو اور کچھ سوچ رہی ہو۔“

میں نے زندگی میں کبھی سگریٹ نہیں پی تھی اور نہ ہی میں نے کبھی تنہا، مووی کیمرے کا سامنا کیا تھا۔ بہرحال میں نے اپنی سی کوشش کی لیکن میری یہ کوشش کیمرا مین کے لیے قطعی مایوس کن تھی۔ اس نے کارلو پونٹی کو مطلع کیا۔ ”اس لڑکی کی کوئی ڈھنگ کی تصویر بنانا ناممکن ہے۔ اس کا چہرہ بہت چھوٹا ہے لیکن منہ بہت بڑا ہے۔ اس کی پیشانی چھوٹی ہے لیکن ناک بہت بڑی ہے......“

یہ تبصرے میں پہلے بھی کئی بار سن چکی تھی۔ میرے نین نقش میں کوئی چیز بہت چھوٹی تھی اور کوئی بہت بڑی...... لیکن اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ اپنی شکل میں نے خود تو نہیں بنائی تھی۔ میرا کیمرا ٹیسٹ دوسرے کئی آدمیوں نے بھی لیا اور ہر ایک نے مایوس کن رائے کا اظہار کیا۔ میرا دل بھی مایوسی سے ڈوبنے لگا۔ وہاں کسی بھی کیمرہ مین کے دل میں میرے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ کوئی بھی اس بناء پر کچھ لحاظ کرتے ہوئے میرے بارے میں امید افزا رائے دینے کے لیے تیار نہیں تھا کہ میں ایک کم عمر اور ناتجربہ کار لڑکی ہوں۔

آخر کار ایک میک اپ مین میری مدد کے لیے آگے آیا۔ وہ ذرا بڑی عمر کا تھا۔ ممکن ہے میری بے چارگی اور مایوسی دیکھ کر اسے اپنے خاندان کی کسی مجھ جیسی کم عمر لڑکی کا خیال آ گیا ہو اور اس کے دل میں میرے لیے کچھ ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے ہوں۔ اس نے آ کر مجھ سے کہا۔ ”مس...... یہ سب کیمرا مین فضول باتیں کر رہے ہیں۔ انہیں اتنا بھی معلوم نہیں ہے کہ تمہارے چہرے کے لیے لائٹنگ ذرا مختلف طریقے سے کرنی پڑتی ہے تاکہ جو چیز بڑی ہے، وہ زیادہ بڑی نظر نہ آئے اور جو چھوٹی ہے، وہ زیادہ چھوٹی نظر نہ آئے۔“

اس دوران کارلو پونٹی غالباً یہ تجویز پیش کرنے کے لیے تمہید باندھ رہا تھا کہ سرجری کے ذریعے میری ناک کو چھوٹا کیا جا سکتا ہے لیکن میں نے سختی کے ساتھ اس کی بات، تمہید کے دوران ہی کاٹ دی۔ حالانکہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ فلم انڈسٹری کا ایک طاقتور آدمی تھا، وہ میرا مستقبل بنانے یا بگاڑنے میں بہت اہم کردار ادا کر سکتا تھا، اس کے باوجود مجھ میں نہ جانے کہاں سے اتنی جرأت آ گئی تھی کہ اصل بات اس کی زبان پر آنے سے پہلے ہی میں نے دوٹوک لہجے میں کہہ دیا۔ ”خدا نے مجھے جیسا چہرہ دیا ہے، میں صرف فلموں میں آنے کے لیے اس چہرے کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کروں گی۔ اگر مجھے اپنے اس چہرے کے ساتھ کوئی کامیابی نہیں مل سکتی تو میں پزولی واپس چلی جاؤں گی۔“

صوفیہ اور ان کا بیٹا کارلو پونٹی جونیئر

شاید میری کم عمری، ناتجربہ کاری اور ناسمجھی نے ہی مجھے یہ خود اعتمادی دی تھی جس نے کارلو پونٹی کو بھی حیران کر دیا۔ اس عمر میں بعض انسان اپنے نفع نقصان کی زیادہ پروا نہیں کرتے بلکہ اپنے ذہن میں جڑ پکڑ جانے والے کسی خیال یا نظریے کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ مجھے نہ جانے کیوں یہ تصور ہی برا محسوس ہوتا تھا کہ اداکارہ بننے کے لیے میں اپنے چہرے کا کوئی حصہ چھوٹا بڑا کروانے کے لیے کاٹ پیٹ...... یعنی سرجری کراؤں۔ ویسے میں ایک شرمیلی اور ڈرپوک سی لڑکی معلوم ہوتی تھی لیکن اپنے اس نظریے پر میں گویا ڈٹ گئی تھی۔

(جاری ہے)

قسط : 11

کارلو نے بہت بعد میں مجھے بتایا کہ جب میں نے بالکل دوٹوک انداز میں یہ بات کی تھی تو اسی لمحے اسے یہ احساس ہوا تھا کہ میرے اندر محض ایک اداکارہ نہیں بلکہ ایک فنکارہ چھپی ہوئی تھی۔ میں نے جب یہ بات سنی تو اسے اپنے لیے ایک قسم کا خراج تحسین سمجھا۔

لائٹنگ وغیرہ تبدیل کر کے دوبارہ میری مختصر سی فلم بنائی گئی اور اسکرین پر اس کا رزلٹ دیکھا گیا۔ شاید آپ سمجھ رہے ہوں کہ اس کے بعد میں یکدم کسی فلم میں ہیروئن آگئی ہوں گی، وہ فلم سپرہٹ ہوگئی ہوگی اور میں راتوں رات سپر اسٹار بن گئی ہوں گی۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ کارلو پونٹی کی ہرممکن مدد کے باوجود مجھے ابتداء میں فلموں میں بہت چھوٹے چھوٹے رول ملے لیکن ان نہایت مختصر اور غیر اہم کرداروں میں کام کرنا بہرحال ایکسٹرا کے طور پر کام کرنے سے بہت بہتر تھا۔ کسی فلم میں مجھے ایک آدھ مکالمہ بھی بولنے کا موقع مل جاتا۔

پھر پہلی بار مجھے دو فلمیں ایسی ملیں جن میں میرا نام بھی آیا......لیکن یہ نام صوفیہ لورین نہیں، صوفیہ لزارو تھا۔ یہ فلمیں Anna اور The Piano Tuner Has Arrived تھیں۔ میں ان دنوں پچاس ہزار لیرے یومیہ کمارہی تھی جو اس وقت کے تقریباً 80 امریکی ڈالر کے برابر تھے۔ میری فیملی جن حالات کی عادی رہی تھی، ان کی مناسبت سے ہمارے لیے یہ آمدنی کسی خزانے سے کم نہیں تھی۔ ہم اپنے نوٹ، بیڈ کے گدے کے نیچے چھپا کر رکھتے۔ رہائش کے لیے ہم نے ایک فرنشڈ کمرہ کرائے پر لے لیا تھا جو ہمیں کچھ چھوٹا تو محسوس ہوتا تھا لیکن پھر بھی ہم وہاں بہت خوش تھے۔

میری چھوٹی بہن ماریا گیارہ سال کی ہو چکی تھی لیکن ہم اسے اسکول میں داخل نہیں کرا سکے تھے کیونکہ میرے اور اس کے والد نے اسے اپنا نام بطور باپ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اگر ہم اسے اسکول میں داخل کراتے وقت ولدیت کے خانے میں کوئی نام نہ لکھتے تو اس کی حیثیت ناجائز بچی کی ہوتی اور یہ بات سارے اسکول کو معلوم ہو جاتی۔ ظاہر ہے، یہ ماریا کے لیے بے حد شرمساری کی بات ہوتی اور وہ اس صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ چنانچہ میں اور مما کام کی تلاش میں نکلتیں تو اسے گھر پر چھوڑ جاتیں جہاں وہ دن بھر اکیلی اور بے کار رہتی۔

ہمیں احساس تھا کہ وہ اپنے آپ کو کس قدر تنہا اور اپنی زندگی کو کس قدر بے مصرف محسوس کرتی ہوگی۔ اس کی صحت بھی کچھ اچھی نہیں رہتی تھی۔ دوسری طرف والد صاحب ہماری کوئی مدد یا سرپرستی تو کیا کرتے، انہوں نے الٹا ہمارے لیے مسائل کھڑے کرنے شروع کر دیے......اور مسائل بھی ایسے جو صرف ہمارے لیے ہی نہیں، ان کے لیے بھی شرمناک ہونے چاہئیں تھے لیکن وہ نہ جانے کس بے حسی اور بے شرمی کے زیر اثر تھے کہ انہوں نے کچھ سوچنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔ حتیٰ کہ انہیں ہم پر رحم بھی نہیں آیا تھا۔

ایک روز صبح سویرے ہی ہمارے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ مما نے دروازہ کھولا تو سامنے پولیس کو کھڑے پایا۔ وہ ہکا بکا رہ گئیں۔

"تم دونوں کو ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا پڑے گا۔" ایک پولیس والے نے مجھ سے اور مما سے کہا۔

"لیکن کیوں؟ ہم نے کیا کیا ہے؟ تمہیں اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ ہمیں پولیس اسٹیشن لے جانے کی بات کرو؟" مما نے غصے سے کہا۔

پولیس والوں نے ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا اور ہمیں پولیس اسٹیشن لے گئے۔ انہوں نے ہمیں لباس تبدیل کرنے کا بھی موقع نہیں دیا اور گھر کے کپڑوں میں

شوہر کارلو پونٹی اور پہلے بچے کے ساتھ
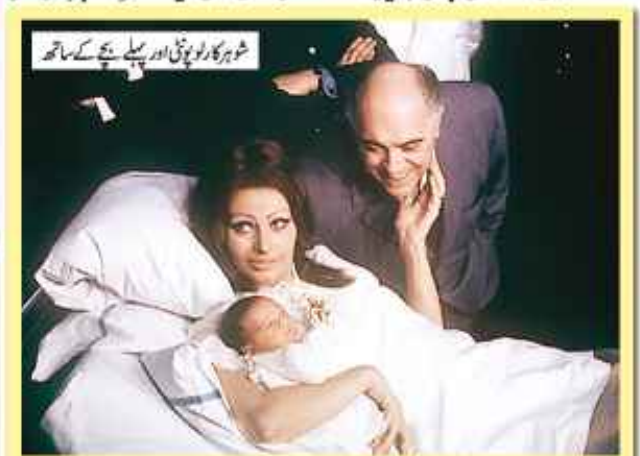
ہی لے گئے۔ پولیس اسٹیشن پہنچ کر انہوں نے ہمیں بتایا کہ ہمارے بارے میں کسی نے شکایت درج کرائی ہے کہ ہمارا ذریعہ آمدنی مشکوک ہے، ہم نے اپنے گھر کو قابل اعتراض سرگرمیوں کا اڈہ بنایا ہوا ہے، ہمارے بارے میں تفتیش کی جائے اور مشکوک چال چلن کی وجہ سے ہمیں روم میں قیام کی اجازت نہ دی جائے۔ جلد ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہمارے خلاف شکایت کرنے والے اور ہم پر یہ شرمناک الزامات عائد کرنے والے خود میرے اپنے والد تھے۔

شاید کوئی بھی اندازہ نہ کر سکے کہ اس وقت ہم ماں بیٹی کس قدر تذلیل اور شرم محسوس کر رہی تھیں۔ ہم خود اپنی نظروں میں شرمندہ ہو گئیں، جب ہمیں پتا چلا کہ پولیس کیوں ہمیں پوچھ گچھ کے لیے پولیس اسٹیشن لائی تھی۔ الزام کی نوعیت اور الزام لگانے والے کا نام سن کر ہمارے لیے گویا ذلت اور شرمساری میں اضافہ ہو گیا۔ تاہم پولیس کو جب ہمارے حالات کا کچھ پس منظر معلوم ہوا اور ہمارے بارے میں شکایت کرنے والے سے ہمارے تعلق یا رشتے کا پتا چلا تو وہ کچھ ٹھنڈے پڑ گئے۔ ان کے رویے میں تبدیلی آگئی۔ انہیں غالباً احساس ہو گیا کہ اپنے گھریلو اور نجی معاملات میں کسی نے انہیں گھسیٹ لیا ہے اور اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔

ہم نے پولیس کو نہ صرف اپنے ذرائع آمدن بتا دیے بلکہ نہایت آسانی سے ان کے ثبوت بھی دے دیے جس پر انہوں نے معذرت کے ساتھ ہمیں چھوڑ دیا۔ ہم گھر واپس تو آگئیں اور ایک بار پھر زندگی کی جدوجہد میں مصروف ہو گئیں لیکن میرے والد کی اس حرکت نے میرے دل پر جو زخم لگایا تھا، وہ شاید کبھی نہ بھر سکے۔

کرائے کے جس کمرے میں ہم رہتی تھیں، وہاں کچن نہیں تھا اور ہمیں وہاں کھانا بنانے کی اجازت بھی نہیں تھی لیکن مما اکثر باتھ روم میں چھپ کر ہیٹر پر کچھ بنا لیتی تھی۔ اس کے لیے ہمیں مکان مالکن کے سونے کا انتظار کرنا پڑتا تھا تاکہ کھانے کی کسی چیز کی خوشبو اس کی ناک تک نہ پہنچ جائے۔ اس قسم کی تنگی اور دشواریوں کے باوجود آج بھی وہ کمرہ مجھے یاد آتا ہے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میرا پہلا ذاتی گھر تھا۔ اب بھی میں کبھی سفر کے دوران، دنیا کے کسی حصے میں، کسی فائیو اسٹار یا سیون اسٹار ہوٹل میں قیام کرتی ہوں تو مجھے وہ کمرہ یاد آ جاتا ہے اور نہ جانے کیوں میرے دل میں ہوک سی اٹھتی ہے۔ اس ہوک کو مٹانے کے لیے میں ہیٹر منگوا کر اس شاندار کمرے یا سوئٹ کے باتھ روم میں جا کر، اور کچھ نہیں تو ایک آملیٹ یا توولز کی ایک پلیٹ ہی بنا لیتی ہوں۔ ان چیزوں کے ذائقے کے ساتھ گویا برسوں پہلے کی ان دھندلی دھندلی یادوں کا بھی اپنا ایک ذائقہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ میں تصور ہی تصور میں اس کمرے میں چلی جاتی ہوں جہاں جدوجہد سے بھرپور نوجوانی کے اس دور میں میرا قیام رہا تھا۔

بہرحال، کچھ عرصے بعد ہم اس کمرے سے ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے۔ مالی حالات اب کچھ اور بہتر ہو چکے تھے۔ ہم تین افراد پر مشتمل، مختصر سی فیملی میں میری حیثیت اب کافی حد تک سربراہ کی سی تھی لیکن زیادہ تر شوٹنگز اور آڈیشنز وغیرہ میں مما ہی ایک سرپرست کی طرح میرے ساتھ ہوتی تھیں۔ اگر میں کام کے لیے کہیں باہر نکلتی اور مجھے گھر واپسی میں دیر ہو جاتی تو مما کی ڈانٹ ڈپٹ بھی سننا پڑتی تھی اور یہ بھی بتانا پڑتا تھا کہ مجھے دیر کیوں ہوئی اور میں کس کے ساتھ تھی۔ دراصل مما نہیں چاہتی تھیں کہ جو غلطی انہوں نے کی تھی، اس قسم کی کوئی غلطی میں بھی کر بیٹھوں یا مجھ سے سرزد ہو جائے۔

ادھر میرا یہ معاملہ تھا کہ میں اگر اپنے کام کی مصروفیات کے بعد کسی چھوٹی موٹی تفریح کی غرض سے، یا کھانے پر جاتی بھی تھی تو صرف کارلو پونٹی کے ساتھ جاتی تھی۔ فلمی دنیا میں اس کے سوا میرے کسی سے اس حد تک بھی مراسم استوار نہیں ہو سکے تھے کہ میں اس کے ساتھ کھانے پر جا سکتی۔ سچی بات یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی مجھے اتنا اچھا لگا ہی نہیں تھا کہ میں اس کے ساتھ کام کے علاوہ کوئی بات کرنے کے بارے میں سوچ سکتی۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ کارلو عمر میں مجھ سے 22 سال بڑا، شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے......لیکن میں سوچتی تھی کہ مجھے کون سا اس کے ساتھ شادی کرنی ہے یا بہت گہرے اور قریبی تعلقات استوار کرنے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ہمارے درمیان یونہی، بس ہلکی پھلکی سی دوستی رہے گی۔ اس وقت تک مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ رفتہ رفتہ ہم ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اس سے مجھے یہ تجربہ بھی ہوا کہ ضروری نہیں، انسان کو پہلی ہی نظر میں کسی سے محبت ہو جائے۔ بعض لوگوں کی محبت دھیرے دھیرے پروان چڑھتی ہے۔ دھیمی بارش کی طرح ہولے ہولے دل کی بستی کو سیراب کرتی ہے۔

کارلو پونٹی، اٹلی کے شہر میلان کے قریب واقع ایک قصبے مگینٹا میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے دادا اس قصبے کے میئر تھے۔ کارلو لڑکپن میں آرکیٹکٹ بننا چاہتا تھا لیکن جب کیریئر کے نقطۂ نظر سے مضامین کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو اس نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا حالانکہ ویسے اسے ہمیشہ سے ادب اور مصوری سے دلچسپی تھی۔ فلمی دنیا میں وہ حادثاتی طور پر آ گیا تھا اور نوجوانی کے زمانے میں ہی اس نے فلمسازی کے میدان میں روم کی اجارہ داری کو چیلنج کرنے کے جذبے کے تحت میلان میں آرٹ فلموں کا ایک پروڈکشن ہاؤس قائم کر لیا تھا۔

1941ء میں اس نے اپنی پہلی فلم Old- Fashioned World بنائی تھی جس کی وجہ سے اس کے سیاسی نظریات کے بارے میں حکومت کو کچھ غلط فہمی ہو گئی اور اسے مختصر مدت کے لیے جیل بھی جانا پڑا۔ دوسری عالمگیر جنگ ختم ہوئی تو اس نے ایک وکیل خاتون سے شادی کر لی جو ایک جنرل کی بیٹی تھی، جس سے اس کے دو بچے تھے۔ ایک بیٹی تھی جس کا نام جنڈ الیا تھا۔ ایک بیٹا تھا جس کا نام ایلیکس تھا۔ شادی کے بعد کارلو روم آ گیا اور یہاں اس نے رکارڈو گالینو کے ساتھ مل کر کام شروع کر دیا۔ رکارڈو گالینو مشہور زمانہ اور تاریخ ساز قسم کے پروڈکشن ہاؤس "لکس" کا بانی تھا۔

جلد ہی کارلو نے اس سے الگ ہو کر اپنا ذاتی پروڈکشن ہاؤس قائم کر لیا اور اس دور کے بڑے بڑے مشہور ڈائریکٹرز کو اپنے ہاں جمع کر لیا۔ وہ ایک کامیاب آدمی تھا اور اس کا شمار بڑے فلم پروڈیوسرز میں ہوتا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس سے اچھی خاصی رسم و راہ بڑھ جانے کے بعد بھی مجھے فلمی دنیا میں اس کے مقام اور حیثیت کا ذرا بھی اندازہ نہیں تھا اور نہ ہی اس نے کبھی مجھے احساس دلانے کی کوشش کی کہ وہ کس حیثیت کا مالک ہے۔ وہ کسی کو بھی اس بات کا احساس دلانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ کسی کو خود سے ہی احساس ہو جاتا تو وہ الگ بات تھی۔

کارلو پونٹی سے دوستی کی وجہ سے مجھے فلمی دنیا میں اپنی جدوجہد کو درست سمت میں آگے بڑھانے میں بھی مدد مل رہی تھی۔ مجھ جیسے کم عمر اور ناسمجھ لوگ جب فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کے لیے آتے ہیں، اگر خوش قسمتی سے انہیں

مارلن برانڈو کے ساتھ چارلی چپلن کی آخری فلم "Countess from Hongkong" میں

کام ملنا شروع ہو جاتا ہے، تب بھی ان میں سے اکثر کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہیں کون سا کام کرنا چاہیے اور کون سا نہیں۔ مجھے ان معاملات میں کارلو کی رہنمائی حاصل رہتی تھی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاید میں اس لیے بھی نوعمری میں، بڑی عمر کے ایک مرد سے متاثر ہو گئی تھی کہ میری زندگی میں باپ کے سائے سے محرومی کا خلا موجود تھا۔ باپ کی محبت اور شفقت میسر آنا تو دور کی بات، مجھے تو یہ طمانیت بھی حاصل نہیں ہو سکی تھی کہ میرا باپ مجھے اپنی بیٹی سمجھتا ہے۔ میرے باپ نے تو مجھ پر اور میری ماں پر آوارگی کا الزام لگا کر ہمیں جیل بھجوانے کی کوشش کی تھی جبکہ ہم نے ان سے کبھی کوئی مطالبہ بھی نہیں کیا تھا، انہیں کبھی تنگ نہیں کیا تھا۔

ممکن ہے، کارلو سے متاثر ہونے کے پیچھے میرے لاشعور کی کوئی نفسیاتی گرہ بھی کارفرما رہی ہو لیکن ظاہر ہے، مجھے اس کا قطعی کوئی ادراک نہیں تھا۔ اس ضمن میں ایک قابل ذکر بات یہ بھی تھی کہ میری اور کارلو کی دوستی دھیرے دھیرے محبت میں ڈھلی تو یہ یک طرفہ محبت نہیں تھی۔ جس شدت سے میں اس کی محبت میں گرفتار ہوئی تھی، اسی شدت سے وہ بھی مجھے چاہنے لگا تھا جبکہ وہ ایک شادی شدہ آدمی اور دو بچوں کا باپ تھا۔ اب میں نہیں کہہ سکتی کہ اس کی محبت کے پیچھے لاشعور کی کون سی نفسیاتی گتھی کارفرما تھی۔ بہرحال، ہم دونوں کو یکساں طور پر ہی احساس ہوا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اس سے پہلے ایک عرصے تک اس کی حیثیت میرے لیے ایک اچھے دوست کے ساتھ ساتھ ایک رہنما یا استاد کی بھی رہی۔ میرا اس وقت فلمی دنیا میں کوئی مقام نہیں تھا لیکن اس نے اپنے قیمتی وقت کا کافی حصہ میری مدد اور رہنمائی میں صرف کیا۔ اس نے مجھے اچھا لباس زیب تن کرنے، اچھے ریسٹورنٹس میں تمام تر آداب اور سلیقے کے ساتھ کھانا کھانے اور اونچے طبقے کے لوگوں میں نشست و برخاست رکھنے اور ان سے گفتگو کے آداب سکھائے۔ مجھے یہ سب کچھ بہت مشکل بھی لگتا تھا لیکن میں خود پر ضبط کر کے، دھیرے دھیرے سیکھ رہی تھی کیونکہ دل ہی دل میں یہ سب کچھ مجھے اچھا لگتا تھا۔

ایک انتہائی نامور اور اچھی اداکارہ کے ساتھ ساتھ اونچے طبقے کی فرد بننا بھی میرا خواب تھا۔ میں ان جیسے طور طریقوں کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ میرا فطری لاابالی پن اور بے پروا طرز زندگی گو کہ مجھے عزیز تھا اور میں اس کی عادی بھی تھی لیکن اونچے طبقے میں ان طور طریقوں پر ناک بھوں چڑھائی جاتی تھی، اس لیے میں انہیں ترک کرنے اور اپنی عادتیں بدلنے کے لیے تیار رہتی تھی۔ کارلو کی رہنمائی حاصل ہونے کی وجہ سے میرے لیے یہ کام کافی حد تک آسان ہو گیا تھا۔

(جاری ہے)

قسط : 12

ایک روز مجھے اٹلی کے ایک بڑے فلم پروڈیوسر لمبارڈو نے بلوایا۔ وہ نیپلز کا رہنے والا تھا۔ ممکن ہے کارلو پونٹی نے ہی اس سے میری سفارش کی ہو۔ میں نے اس کی تصدیق نہیں کی۔ لمبارڈو مجھے اپنی آئندہ فلم Africa Under The Seas میں مرکزی کردار میں کاسٹ کرنا چاہتا تھا۔

"سینورا! آپ چونکہ نیپلز کے قریبی علاقے کی رہنے والی ہیں، اس لیے تیراکی تو یقیناً آپ کو آتی ہوگی؟" لمبارڈو نے گفتگو شروع کرتے ہوئے کافی وثوق سے کہا۔

نہ جانے کیوں اس نے فرض کیا ہوا تھا کہ صرف نیپلز ہی نہیں، بلکہ اس کے آس پاس کے علاقوں میں رہنے والے تمام مردوں اور عورتوں کو تیراکی ضرور آتی ہوگی۔ ادھر میرا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی پروڈیوسر یا ڈائریکٹر اگر مجھ سے پوچھتا تھا کہ کیا آپ کو فلاں کام آتا ہے، تو میں فوراً اثبات میں جواب دیتی تھی۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھتا کہ کیا آپ کو طیارہ شکن توپ چلا کر جہاز گرانا آتا ہے، تو شاید میں اس کے جواب میں بھی ہاں کہہ دیتی۔ دراصل مجھے صرف یہ فکر لاحق رہتی تھی کہ اگر میں نے کہہ دیا، فلاں کام مجھے نہیں آتا تو کہیں مجھے فلم میں کام دینے سے انکار نہ کر دیا جائے۔

چنانچہ میں نے لمبارڈو کے سوال کے جواب میں بھی حسب معمول "یس" کہا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس بار میرا یہ ایک لفظ مجھے تقریباً موت کے منہ میں لے جائے گا۔ لمبارڈو نے نہ صرف اس فلم میں مرکزی کردار مجھے دیا بلکہ میرا یہ نام "صوفیہ لورین" جس سے میں بین الاقوامی سطح پر مشہور ہوں، اسی کا دیا ہوا ہے۔ وہ میرے نام "صوفیہ لزارو" سے مطمئن نہیں تھا جو اس وقت تک اطالوی فلموں میں چل رہا تھا۔ وہ مجھے صرف اٹلی کی ایک اداکارہ کے طور پر نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ ان امکانات پر غور کر رہا تھا کہ اگر مجھے بین الاقوامی فلم انڈسٹری کی توجہ حاصل ہو جائے تو میرا نام ایسا ہونا چاہیے جو دنیا بھر کے لوگوں کی زبان پر جلد ہی چڑھ جائے اور وہ جلدی اس سے مانوس ہو جائیں۔ بہت غور و خوض کے بعد اس نے میرا نام صوفیہ لورین رکھا تھا اور اس میں "صوفیہ" کی اسپیلنگ بھی تبدیل کر دی تھی۔

فلم "افریقہ انڈر دی سیز" کی شوٹنگ ایک جزیرے کے قریب گہرے سمندر میں شروع ہوئی۔ مجھے ایک بحری جہاز کے عرشے پر کھڑا کر دیا گیا اور ڈائریکٹر نے چھوٹے سے لاؤڈ اسپیکر پر آواز لگائی۔ "سمندر میں چھلانگ لگا دو۔"

میں نے اس سے پہلے کبھی سمندر میں قدم بھی نہیں رکھا تھا لیکن اس وقت میں اپنے آپ کو سمجھا چکی تھی کہ اگر میں نے ایک لمحہ بھی سوچنے میں صرف کیا تو میں خوفزدہ ہو جاؤں گی اور ڈائریکٹر کے حکم پر عمل نہیں کر پاؤں گی۔ چنانچہ میں نے ذرا بھی سوچے سمجھے بغیر آنکھیں بند کر کے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ عین ممکن ہے میری زندگی کی کہانی یہیں ختم ہو جاتی اور میں صوفیہ لورین کے نام سے دنیا میں شہرت پانے سے بہت پہلے، اسی روز اس دنیا سے رخصت ہو جاتی لیکن قدرت کو میری زندگی منظور تھی۔ پانی میں خوفناک ہلچل برپا تھی اور میں ابھی پانی میں غوطے کھا ہی رہی تھی کہ کسی کے مضبوط بازوؤں نے مجھے تھام لیا اور پھر چند ہی لمحوں میں مجھے پانی سے نکال لیا گیا۔

وہ دراصل ایک لائف گارڈ تھا جسے احتیاطاً شوٹنگ کی جگہ پر تعینات کیا گیا تھا۔ مجھے ڈبکیاں کھاتے دیکھ کر اسے یقیناً اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے تیرنا نہیں آتا لیکن وہ مجھ سے زیادہ ڈائریکٹر پر برہم تھا جس نے مجھے اس جگہ چھلانگ لگانے کے لیے کہا تھا کیونکہ وہاں بحری جہاز کے وہ بہت بڑے عقبی پنکھے چل رہے تھے جو جہاز کو آگے دھکیلتے ہیں اور جن کی وجہ سے وہ پانی میں آگے بڑھتا ہے۔ جہاں پنکھے گھومتے ہیں وہاں پانی میں بہت دور تک خوفناک ہلچل برپا رہتی ہے۔ اس حصے میں اچھے بھلے تیراک کے لیے بھی تیرنا مشکل ہوتا ہے لیکن ڈائریکٹر نے مجھے وہاں چھلانگ لگانے کے لیے کہہ دیا تھا۔

یہ اس کا اناڑی پن تھا اور مجھ جیسی لڑکی جو کبھی سوئمنگ پول میں بھی نہیں تیری تھی، اس کی حماقت کی انتہا یہ تھی کہ اس نے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر سے اس معاملے میں جھوٹ بولا تھا، اس نے معاملے کی سنگینی کا اندازہ ہی نہیں لگایا تھا۔ اس فلم کی تو زیادہ تر شوٹنگ سمندر کے گہرے پانیوں میں ہی تھی۔ میرا جھوٹ اس معاملے میں کہاں تک میرا ساتھ دے سکتا تھا؟ اس روز ہی مجھے زندگی کا یہ ایک اور اہم سبق حاصل ہو گیا کہ جھوٹ انسان کی زندگی میں دور تک کیا، دو قدم بھی اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ زندگی میں ہر مرحلے پر سچ بولنا انسان کو نہ جانے کتنی پریشانیوں سے بچاتا ہے۔

اس دن سے میں نے طے کر لیا کہ خواہ مجھے کوئی فلم ملے یا نہ ملے لیکن میں کوئی ایسا دعویٰ نہیں کروں گی جس پر میں پوری نہ اتر سکوں۔ بہرحال، مجھے اس فلم سے کٹ نہیں کیا گیا بلکہ اسی روز سے تیراکی سکھانی شروع کر دی گئی جو میں نے دو تین دن میں ہی سیکھ لی۔ اس وقت سے آج تک میں پانی میں مچھلی کی طرح تیرتی ہوں۔

روم کا "سینما سٹی" واقعی ایک الگ قسم کا شہر تھا اور میرا اس شہر میں دل لگ گیا تھا۔ میری جدوجہد جاری تھی اور مجھے بہتر قسم کے رول ملنے لگے تھے تاہم میں ابھی اطالوی فلموں تک ہی محدود تھی۔ میں "سینما سٹی" کی گلیوں میں پھرتی رہتی۔ ایک فلم کے سیٹ سے دوسری فلم کے سیٹ پر جاتی رہتی۔ مجھے اس طرح سینما سٹی میں ادھر اُدھر گھومنا پھرنا اچھا لگتا تھا۔ اسی دوران مجھے اکثر کچھ نہ کچھ فائدہ بھی پہنچ جاتا تھا۔ کبھی کسی کام کے آدمی سے ملاقات ہو جاتی تھی جو مجھے مفید مشوروں سے نوازتا تھا اور کبھی یونہی چلتے پھرتے مجھے کوئی فلم مل جاتی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی کسی پروڈیوسر یا ڈائریکٹر کو خیال آتا تھا کہ میں اس کی فلم کے مرکزی یا ثانوی کردار کیلئے موزوں ہوں۔ سینما سٹی میں ہی میری ایسے بہت سے افراد سے شناسائی ہوئی، جن سے مجھے رہنمائی ملی اور زندگی بھر کیلئے میرے ان سے بہت اچھے مراسم استوار ہو گئے۔ میرے لئے وہ گھر کے فرد کی طرح ہو گئے۔

دوسری طرف مجھے کارلو پونٹی کی مدد اور رہنمائی بھی حاصل تھی۔ اس کے دفتر میں بھی بہت سے، کام کے لوگوں سے میری ملاقات ہوتی تھی۔ ان سب لوگوں کی نوازشات، میری محنت اور بہت سے اتفاقات کی وجہ سے اطالوی فلم انڈسٹری میں میرا نام خاص نمایاں ہو چکا تھا۔ تاہم جدوجہد کا یہ دور خاصا صبر آزما تھا۔ بنیادی اور فطری طور پر میں اپنے خول میں بند رہنے والی لڑکی تھی لیکن فلم کے شوق نے مجھے اپنے خول سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بہرحال، اب بھی یہ ضرور تھا کہ اگر ابتدائی ملاقاتوں کے بعد کوئی شخص مجھے اچھا نہیں لگتا تھا تو میں خاموشی سے اس سے دور ہو جاتی تھی اور کوئی ناخوشگوار صورتحال پیدا نہیں ہونے دیتی تھی۔ مجھے نہ تو اپنے آپ کو کسی مشکل صورت حال میں ڈالنا گوارا تھا اور نہ ہی میں کسی اور کیلئے پریشانی کا باعث بننا پسند کرتی تھی۔

میری خوش قسمتی تھی کہ خدا نے نوجوانی میں ہی مجھے اپنے برے بھلے کو سمجھنے کا شعور دیا تھا۔ مما اکثر کسی روایتی قسم کی، شکی مزاج ماں کی طرح میرے بعض فیصلوں کے بارے میں تشویش کا اظہار کرتی رہتیں لیکن جلد ہی انہیں تسلیم کرنا پڑتا کہ میرا فیصلہ درست تھا۔ انہیں سب سے زیادہ اسی بات کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ میں ان جیسی کوئی غلطی نہ کر بیٹھوں لیکن میری خوش قسمتی تھی کہ میں عقل پر جذبات کو غالب آنے نہیں دیتی تھی۔

1954ء میں میری فلم Woman Of The River کے آخری منظر کی شوٹنگ چل رہی تھی تو ایک روز کارلو فلم کے سیٹ پر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈبیا تھی، جس پر مخمل کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ جب شوٹنگ میں وقفہ آیا تو اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور ایک طرف لے گیا۔ تخلیے میں بھی اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا، بس خاموشی سے وہ ڈبیا مجھے تھما دی۔ مجھ پر تجسس غالب آیا اور میں نے اسے وہیں کھول کر دیکھ لیا۔ اس میں ہیرے کی ایک خوبصورت انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے کارلو کی طرف دیکھا تو اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ وہ اب بھی کچھ کہنے کیلئے تیار نہیں تھا لیکن اس کی خاموشی نے سب کچھ کہہ دیا۔

اسی طرح خاموشی سے ہمارے درمیان تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ ہم نے کبھی اس موضوع پر بات نہیں کی تھی کہ ان تعلقات کا انجام کیا ہوگا؟ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے اور اسے بھی نہیں معلوم تھا کہ میں نے کیا سوچ کر اپنا آپ اس کے سپرد کیا ہے۔ اگر یہ سوال مجھ سے کرتا تو شاید میں بھی کوئی جواب نہ دے پاتی کیونکہ میرے پاس اس سوال کا جواب تھا ہی نہیں...... کارلو جس طرح خاموشی سے آیا تھا، مجھے انگوٹھی دے کر اسی طرح خاموشی سے واپس چلا گیا۔ میں نے اس انگوٹھی کو آنکھوں سے لگایا اور پھر بے اختیار چوم لیا لیکن اسی لمحے میرا دل بھر آیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔

اس روز میں گھر واپس پہنچی تو مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے کوئی تاج پہنا دیا گیا ہے لیکن جب میں نے مما کو انگوٹھی دکھائی اور اس کے بارے میں بتایا تو ان کا ردعمل میری توقع کے مطابق تھا۔ وہ شکوک و شبہات اور اندیشوں میں مبتلا ہو گئیں۔ کارلو پونٹی کا مجھے انگوٹھی دینے کا مقصد یہی تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن مما کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بے جوڑ شادی کس طرح ہوگی اور اگر ہو گئی تو اس کا انجام کیا ہوگا؟

"یہ تم کیا کرنے جا رہی ہو صوفیہ؟" انہوں نے بے حد تشویش سے کہا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کارلو شادی شدہ ہے اور اس کے دو بچے بھی ہیں؟ صرف یہی نہیں بلکہ وہ تم سے عمر میں 22 سال بڑا بھی ہے۔ تم بھلا اس سے کیا توقعات رکھ سکتی ہو؟ اب بھی وقت ہے...... تم پیچھے ہٹ جاؤ اور اپنی زندگی، اپنا کیریئر بنانے پر توجہ دو۔ تم ابھی اتنی کم عمر ہو۔"

بات اسی دن ختم نہیں ہوئی۔ آنے والے دنوں میں بھی یہ موضوع ہمارے گھر میں چلتا رہا۔ مما نے کئی بار مجھ سے پوچھا "تم نے اس سے بات کی؟ تمہارا مستقبل کیا ہوگا؟ یہ گاڑی کس طرح چلے گی؟"

میں کیا بتاتی؟ مجھے کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ میں نے کارلو سے کبھی اس قسم کی باتیں نہیں کی تھیں اور نہ ہی اب کر سکتی تھی۔ مجھے تو بس یہ معلوم تھا کہ میں اس سے محبت کرتی تھی اور وہ بھی مجھے چاہتا تھا۔ وہ میری زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ اس کی شادی کافی دنوں پہلے ختم ہو چکی تھی۔ تاہم ابھی باقاعدہ طور پر طلاق نہیں ہوئی تھی۔ اکثر میرا کافی وقت اس کے وسیع اور شاندار اپارٹمنٹ میں گزرتا تھا۔ ان دنوں میں، مما اور ماریا، جس اپارٹمنٹ میں رہ رہی تھیں، وہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

کارلو کے دونوں بچے ماں کے ساتھ تھے۔ وہ زیادہ بڑے نہیں تھے۔ شاید کوئی یقین نہ کرے لیکن یہ سچی بات ہے کہ میں ان کیلئے اپنے دل میں درد محسوس کرتی تھی۔ مجھے یہ سوچ کر اچھا محسوس نہیں ہوتا تھا کہ ان بچوں کے والدین میں علیحدگی ہو چکی تھی لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ ان کی ازدواجی زندگی کے اس انجام میں میرا کوئی کردار نہیں تھا۔ کارلو اور اس کی بیوی کے درمیان اختلافات اس وقت سے چل رہے تھے جب میں نے اور کارلو نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ کارلو سے میرے تعلقات استوار ہونے کی نوبت آنے سے کافی پہلے ان کے درمیان علیحدگی ہو چکی تھی۔ میں اس کے حالات کو بدلنے میں بھی کوئی کردار ادا نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے، بس میں نے اس کی محبت کے سہارے آنکھیں بند کر کے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے اپنی محبت پر اعتماد تھا کہ وہ مجھے کسی نہ کسی منزل تک لے جائے گی...... اور اگر نہ بھی لے گئی ہوتی تو شاید مجھے کوئی افسوس نہ ہوتا۔ محبت تو خراج مانگتی ہے...... اور میں خراج ادا کرنے کیلئے تیار تھی۔ اپنی تمام تر نوجوانی اور ناتجربہ کاری کے باوجود میں دل ہی دل میں اتنا بڑا فیصلہ کیے بیٹھی تھی۔

(جاری ہے)

صوفیہ لورین کی داستانِ حیات

مجھے پوری دنیا میں شہرت حاصل ہونے لگی

تمکین تبسم

قسط : 13

1954ء میرے لیے بہت اہم فیصلوں اور بڑی بڑی تبدیلیوں کا سال تھا۔ اس سال کے دوران میں نے اس زمانے کے بڑے بڑے اداکاروں کے ساتھ کام کیا۔ مجھے ہیروئن کے کردار ملنا شروع ہوئے۔ میں نے صرف المیہ ہی نہیں، طربیہ اداکاری بھی کی، یعنی ٹریجڈی اور کامیڈی، دونوں میں ہی اپنی صلاحیتوں کو آزمالیا اور دونوں میں ہی کامیاب رہی۔ میں اب اسٹار بن رہی تھی اور دنیا میں میرا چرچا ہونے لگا تھا۔ کارلو سے میرا تعلق مضبوط تر ہوگیا تھا۔ اسی سال مجھے پہلی بار ایک اطالوی فلم کے ساتھ کانز فلم فیسٹیول میں شرکت کا بھی موقع ملا۔ اس سال میں شوبز کی مصروفیات کے سلسلے میں ہی برلن اور لندن بھی گئی۔

مجھے اپنے ہی ملک کے ایک شہر میلان جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ میں پہلی بار وہاں گئی تھی۔ میرا استقبال کرنے والوں میں شہر کا میئر بھی شامل تھا۔ ہر جگہ ہولی وڈ وغیرہ کے بڑے بڑے اسٹارز کے ساتھ میری تصویریں کھینچی جاتیں جو مختلف ملکوں اور مختلف زبانوں کے اخبارات و رسائل میں شائع ہوتیں۔ روم کے "سینما سٹی" میں خاص طور پر میرے لیے پبلک ریلیشنز ایجنٹ کا تقرر کیا گیا جو مختلف طریقوں سے کوشش کرتا تھا کہ میڈیا میں مجھے زیادہ سے زیادہ کوریج ملتی رہے اور زیادہ سے زیادہ جگہوں پر میرا تذکرہ ہوتا رہے۔

یہ سب میرے اسٹار بننے کی نشانیاں تھیں لیکن اندر سے میں اب بھی ایک نوخیز اور عام سی لڑکی تھی جو گویا حیرت سے آنکھیں پھاڑے خود اپنے ساتھ ہونے والا یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ جو دوسری عام سی لڑکیوں کی طرح کسی سے محبت کرتی تھی، شادی کرنا چاہتی تھی، گھر بسانا چاہتی تھی اور ماں بننا چاہتی تھی۔ باطنی طور پر مجھے اپنے آپ میں کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوتی تھی۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ مجھے اداکارہ بننے کا شوق تھا۔ میرا یہ شوق برقرار تھا اور اس میدان میں کامیابی کے لیے میں دل و جان سے محنت کرتی تھی۔

1955ء میں مجھے اس دور کی تین بڑی اطالوی اداکاراؤں میں شمار کیا گیا اور اس حیثیت سے ایک بڑی تقریب میں ایوارڈ دیا گیا۔ دوسری دو بڑی اداکارائیں جینا لولو بریجیڈا اور ایلینا میگنانی تھیں۔ یہ بھی میری زندگی کا ایک اہم سنگ میل تھا جو ظاہر کرتا تھا کہ میں کامیابیوں کے راستے پر بتدریج آگے بڑھ رہی تھی۔ اٹلی بھی دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے سنبھل چکا تھا۔ معیشت ترقی کر رہی تھی۔ اٹلی میں بہت اچھی فلمیں بن رہی تھیں جن کا دنیا بھر میں چرچا ہوتا تھا۔ فلم انڈسٹری پھل پھول رہی تھی اور بہت اچھا کام ہو رہا تھا۔

اس دوران ایک فلم "اسکینڈل ان سورینٹو" (Scandal in Sorrento) میں جینا لولو بریجیڈا کو کاسٹ کیا گیا۔ اس سے پہلے یہ فلم تین حصوں پر مشتمل ایک سیریز کی صورت میں بن چکی تھی اور اس کے تینوں حصوں یا قسطوں میں جینا لولو بریجیڈا ہی نے کام کیا تھا لیکن جب اس کا چوتھا حصہ "اسکینڈل ان سورینٹو" کے نام سے بننے لگا تو جینا نے اس میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ شاید وہ ایک ہی کردار کی چھاپ اپنے اوپر لگوانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی جگہ مجھے کاسٹ کر لیا گیا۔

اس معاملے کو پریس میں خوب اچھالا گیا۔ پریس [illegible] لگی مجھے اور جینا کو ایک دوسرے کی حریف ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے، حالانکہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو حریف قطعی نہیں سمجھتی تھیں اور نہ ہی ہمارے درمیان کسی قسم کا جذبہ رقابت موجود تھا۔ جینا کا اپنا ایک مقام تھا اور میرا اپنا۔ ہمارے ایک ساتھی اداکار وٹوریو ڈی سیکا نے البتہ ہم دونوں میں ایک قدر مشترک تلاش کی تھی۔ اس نے اپنے ایک انٹرویو میں ہم دونوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا "دونوں بھرپور سراپا کی مالک ہیں۔"

تاہم پریس ہمارے درمیان ایک فرضی رقابت تخلیق کرنے کی کوششوں میں لگا رہتا تھا۔ اس سے شوبز کی خبروں میں ذرا گرما گرمی رہتی تھی۔ اس بات کا تذکرہ میں صرف یہ بتانے کے لئے کر رہی ہوں کہ یہ کام بہت سال پہلے سے ہوتا آرہا ہے۔ آج بھی آپ پریس میں یا ٹی وی چینلز پر بہت سی اداکاراؤں کے بارے میں اس قسم کی خبریں دیکھتے ہوں گے جن سے تاثر ملتا ہوگا کہ شاید وہ ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہیں، حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔ سب اپنے اپنے کام اور اپنی اپنی زندگی میں مگن اور مصروف ہوتی ہیں۔ ان کے پاس رقابت محسوس کرنے کی بھی فرصت نہیں ہوتی اور نہ ہی شخصیتیں اس کی اجازت دیتی ہیں۔ البتہ اگر کسی کے دل میں کچھ ہو تو اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

میرا نام اب دنیا بھر میں جانا پہچانا تھا۔ "ٹائم"، "نیوز ویک" اور "لائف" جیسے رسالوں کے سرورق پر میری تصویر چھپ چکی تھی۔ دنیا بھر کی فلم انڈسٹریز کی طرف سے کارلو پونٹی سے رابطے شروع ہوگئے تھے۔ کئی ملکوں کے پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز مجھے اپنی فلموں میں کاسٹ کرنا چاہتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ اس کے لئے انہیں کارلو سے رابطہ کرنا پڑے گا۔ کارلو [illegible] بلاوے پر لاس اینجلس گیا ہوا تھا جہاں دنیا کی سب سے [illegible] انڈسٹری "ہولی وڈ" موجود تھی۔

ایک روز مجھے کارلو کا [illegible] موصول ہوا۔ اس نے لکھا تھا "صوفیہ! اگر تم امریکا کو فتح کرنا چاہتی ہو تو اس کے لئے تمہیں انگریزی سیکھنا پڑے گی۔"

جس وقت وہ اپنی سیکریٹری کو اس ٹیلی گرام کا مضمون لکھوا رہا تھا، اسی دوران اس نے روم میں موجود ایک خاتون [illegible] اسپین کو فون بھی کر دیا تھا۔ اس نے کوئی تمہید نہیں باندھی اور [illegible] ہی سارہ کو بات کرنے کا موقع دیا۔ اس نے گویا فیصلہ سنا دیا۔ "سارہ! آپ جو کچھ بھی کر رہی ہیں یا کرنے والی ہیں، اس کا خیال دل سے نکال دیں۔ آپ کو بس صوفیہ لورین کو اس طرح انگریزی سکھانی ہے کہ اس سے ملنے والا یہ سمجھے کہ وہ انگریزی میں سوچتی ہے، انگریزی لکھتی ہے اور انگریزی بولتی ہے، شاید اسے کوئی دوسری زبان آتی ہی نہیں۔"

سارہ اگر کچھ کہنا چاہتی تھی تو وہ اس کے دل میں ہی رہ گیا۔ وہ دوسرے ہی دن فلم "لکی ٹو بی اے وومن" (Lucky To Be A Woman) کے سیٹ پر پہنچ گئی، جس میں ان دنوں میں کام کر رہی تھی۔ وہ ایک گول مٹول سی آئرش عورت تھی جو اگر کوئی ذمے داری قبول کر لیتی تھی تو ہر حال میں اسے پورا کر کے چھوڑتی تھی۔ پہلے دن ہی اسے مجھ سے صرف بات کرنے کے لئے دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ جب اسے یہ موقع میسر آیا، اس وقت میں دوسری فلم کے سیٹ پر جارہی تھی۔ اس دن کے بعد سے یہ اس کا معمول بن گیا کہ وہ ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہتی اور جونہی اسے موقع میسر آتا، وہ مجھے انگریزی سکھانا شروع کر دیتی۔ وہ ایک نہایت مستقل مزاج عورت تھی اور مجھے زبانیں سیکھنے کا بہت شوق تھا، اس لئے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود میں تیزی سے انگریزی سیکھنے لگی۔

اس دوران کارلو کو پتا چلا کہ ہولی وڈ کی مشہور فلم "ہائی نون" (High Noon) کا ڈائریکٹر اور پروڈیوسر اسٹینلے کریمر اسپین میں تھا۔ وہاں نپولین کے دور کی ایک کاسٹیوم فلم کی شوٹنگ کیلئے لوکیشنز دیکھ رہا تھا۔ اس فلم کا نام "دی پرائڈ اینڈ دی پیشن" (The Pride and The Passion) رکھا گیا تھا۔ اس کی یہ فلم کاسٹنگ کے مرحلے سے ہی بحرانوں کا شکار تھی۔ شروع میں مارلن برانڈو اور ایوا گارڈنر کو اس میں مرکزی کردار ادا کرنا تھا لیکن مارلن برانڈو پیچھے ہٹ گئے تھے اور ان کی جگہ فرینک سناترا کو کاسٹ کر لیا گیا تھا جو اداکار ہونے کے ساتھ ساتھ مشہور زمانہ گلوکار بھی تھے۔ مسئلہ یہ اٹھ کھڑا ہوا کہ فرینک سناترا کی ایوا سے علیحدگی کے بعد سرد جنگ چل رہی تھی۔ ہولی وڈ کی بہت سی فلمیں اپنے آغاز سے ہی ——یا پھر تکمیل کے دوران اسی قسم کے بحرانوں کا شکار رہتی ہیں۔

اس مجوزہ فلم کے بارے میں ابھی تک صرف یہ بات یقین سے کہی جا سکتی تھی کہ کیری گرانٹ اس میں ہوں گے۔ وہ ہولی وڈ کے اتنے بڑے اسٹار تھے کہ ہم جیسے تو ان کا نام ہی سن کر مرعوب ہو جاتے تھے۔ وہ فلم کا معاہدہ کرتے وقت یہ شرط رکھتے تھے کہ باقی کاسٹ کے ناموں پر اگر انہیں اعتراض نہیں ہوگا تبھی انہیں سائن کیا جائے گا۔ میں سوچ میں پڑ گئی کہ کیا وہ ایک اطالوی اداکارہ کے ساتھ کام کرنا پسند کریں گے؟ انہوں نے تو شاید میری کوئی فلم بھی نہیں دیکھی ہوگی۔ کارلو اس قسم کی باتوں سے بددل ہونے والا نہیں تھا۔ اس نے اسٹینلے کریمر کو روم مدعو کیا اور اسے میری فلم "وومن آف دی ریور" (Woman of The River) دکھائی۔ فلم ختم ہوتے ہی اسٹینلے نے مجھے اور کارلو کو بلا تمہید یہ کہہ کر حیران کر دیا۔ "میں مس صوفیہ لورین کو اپنی آئندہ فلم کے لئے دو لاکھ ڈالر میں سائن کر سکتا ہوں۔"

وہ 1956ء کا آغاز تھا اور دنیا میں بڑی تبدیلیاں آرہی تھیں۔ ہر شعبے میں اہم واقعات رونما ہو رہے تھے۔ پرنس رینئر اور گریس کیلی کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مرلین منرو اور آرتھر ملر کی شادی دو ماہ بعد ہونی تھی۔ روس کے کچھ علاقوں میں گڑبڑ شروع ہو چکی تھی۔ فروری میں، میں اسپین پہنچی تاکہ ہولی وڈ کے ان دوسرے اداکاروں سے ملاقات کر لوں جو "دی پرائڈ اینڈ دی پیشن" میں میرے ساتھ کام کر رہے تھے۔ میڈرڈ ایئرپورٹ پر اتر کر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہاں میرے کم از کم پانچ سو مداح استقبال کے لئے موجود تھے، جو میرے نام کے نعرے لگا رہے تھے اور ہسپانوی زبان کا ایک لفظ بول رہے تھے جس کا مطلب تھا "خوبصورت"

وہاں میری ملاقات لوسیا بوس سے بھی ہوئی جو لڑکپن میں میری آئیڈیل اداکارہ اور ماڈل تھی۔ اس نے اسپین کے ایک مشہور بل فائٹر لوئی میگل سے شادی کر لی تھی۔ انہوں نے مجھے بل فائٹنگ دکھانے کا انتظام بھی کر رکھا تھا، جہاں کچھ خوبصورت اور یادگار گروپ فوٹو بھی بنائے جاسکتے تھے۔ وہاں انہوں نے مجھے بل فائٹرز والا لباس بھی پہننے کے لئے دے دیا۔ میں اس وقت 21 سال کی ایک پرجوش لڑکی تھی اور ایڈونچرز سے نہیں گھبراتی تھی۔ میں وہ لباس پہن کر مذاق ہی مذاق میں، میدان میں کود گئی۔ شاید اس وقت وہاں کوئی مجھ سے بھی زیادہ مذاق کے موڈ میں تھا جس نے دروازہ کھول کر ایک بپھرے ہوئے سانڈ کو آزاد کر دیا۔

سیاہ رنگ کا وہ بل اس رفتار سے میری طرف آیا کہ میں اسے ٹھیک طرح دیکھ بھی نہیں سکی۔ مجھے بس یوں لگا جیسے سیاہ رنگ کا کوئی بگولا طوفانی رفتار سے میری طرف آرہا ہے۔ ایک بار پھر میری زندگی کی کہانی ختم ہوتے ہوتے بچی۔ میرے میزبان لوئی میگل کو بل فائٹنگ کافی عرصہ پہلے چھوڑ چکے تھے لیکن ان کی صلاحیتیں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ وہ نہایت بروقت ایرینا میں کودے اور مجھے دھکیل کر ایک طرف لے گئے۔ سانڈ آندھی طوفان کی طرح وہاں سے گزر گیا جہاں میں ایک لمحہ پہلے موجود تھی۔ اگر لوئی میگل نے مجھے وہاں سے نہ دھکیلا ہوتا اور میں خوف کے مارے بت بنی وہیں کھڑی رہتی تو شاید سانڈ کے نوکیلے سینگ میرے جسم میں پیوست ہو جاتے، پھر وہ مجھے ہوا میں اچھالتا اور پھر شاید اپنے کھروں سے مجھے کچل کر میرا ملیدہ بنا دیتا۔

(جاری ہے)

بیٹے کے ساتھ

Sophia Loren

ہماری دوستی محبت میں ڈھل رہی تھی

تمکین تبسم

قسط : 14

جب لوئی میگل کی مدد سے میں محفوظ حصے میں پہنچ گئی تو میں نے اپنا جائزہ لیا۔ میں سر سے پاؤں تک مٹی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ میں بدحواسی سے ہنسنے لگی۔ لوئی میگل بھی میرے ساتھ ہنس رہا تھا۔ ایک کہانی، جو نہایت المیہ بھی ہوسکتی تھی، اسے ایک طربیہ انجام مل گیا تھا۔

صوفیہ اور اطالوی ایکٹر، ڈائریکٹر ڈی سیکا

دوسرے روز مجھے میرے ساتھی اسٹارز فریبک سناترا اور کیری گرانٹ سے متعارف کرانے اور پریس سے ملوانے کے لئے میڈرڈ کے سب سے شاندار ہوٹل میں ایک تقریب رکھی گئی تھی۔ اس تقریب میں اتنے بڑے اسٹارز، دنیا بھر کے پریس رپورٹرز اور فوٹوگرافرز کا سامنا کرنے کے تصور سے میں بری طرح نروس تھی۔ میں نے اعلیٰ درجے کے بوتیک کے بیسیوں لباس تبدیل کرکے دیکھے۔ میں فیصلہ نہیں کرپارہی تھی کہ کس لباس میں زیادہ اچھی لگوں گی۔ بیسیوں مرتبہ نئے سرے سے میں نے میک اپ کرایا۔ پچاسوں مرتبہ میں نے ان جملوں کی مشق کی جو میں کیری گرانٹ اور فریبک سناترا سے پہلی بار سامنا ہونے پر بولنا چاہتی تھی۔ مجھے اس خیال سے بھی ذرا گھبراہٹ ہورہی تھی کہ ابھی مجھے انگریزی پر عبور حاصل نہیں ہوا تھا۔ میں بس گزارے لائق انگریزی بولتی اور سمجھتی تھی۔ شاید یہ میری خوش قسمتی تھی کہ تقریب میرے حق میں بہت اچھی رہی۔ میرے ساتھی اسٹارز اور پریس کے لوگوں نے مجھے پسند کیا۔ شاید اس کی ایک وجہ تھی کہ عین تقریب میں جاتے وقت میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں فطری طور پر جیسی ہوں، مجھے اپنے آپ کو بالکل اسی طرح سب لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہئے۔ میرے انداز اطوار اور میری گفتگو میں تصنع بالکل نہیں ہونا چاہئے۔ میرا یہ فیصلہ بہت اچھا ثابت ہوا۔ پریس والوں نے مجھ سے ڈھیروں باتیں کیں۔ میری لاتعداد تصویریں کھینچی گئیں۔ کیری گرانٹ سے میرے بہت اچھے مراسم کی ابتدا ہوئی۔ یہ مراسم آگے چل کر فلم Pride And Passion کی، چھ ماہ پر محیط سخت پُرمشقت شوٹنگ کے دوران اور بھی مضبوط ہوگئے۔

ہم ابھی شوٹنگ کے لئے اسپین میں ہی مقیم تھے جب ایک روز کیری گرانٹ نے مجھے کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے سے پہلے اس نے اپنی چمکیلے سرخ رنگ کی ایم جی کار میں مضافاتی علاقے کی سیر کرائی، یہ کار اسے پروڈکشن کمپنی نے دلوائی تھی۔ ہولی وڈ کے اداکاروں میں ان دنوں کیری گرانٹ کا مقام یہ تھا کہ وہ فلم کے سیٹ پر اپنی کسی خواہش کا اظہار کردیتا تھا تو وہ گویا فلم کمپنی والوں کے لئے ایک حکم بن جاتی تھی جس کی تعمیل کرنا ان کے لئے ضروری ہوجاتا تھا۔ اس روز سیر اور کھانے کے دوران اس سے بہت باتیں ہوئیں۔ اس نے اپنی ذات اور ہولی وڈ کے بارے میں مجھے بہت کچھ بتایا۔

ہولی وڈ کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ”وہ خیالوں اور خوابوں کی دنیا کی طرح ہے، اگر تم اسے اچھی طرح سمجھ لوگی تو تمہیں دل ٹوٹنے کا صدمہ نہیں اٹھانا پڑے گا، اگر تم ہولی وڈ کو سمجھ نہ سکیں تو تمہیں قدم قدم پر اپنے جذبات مجروح ہونے کا صدمہ برداشت کرنا پڑے گا۔“

ہمارا اب کافی وقت ساتھ گزرنے لگا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں ہر لمحے اس سے کچھ نہ کچھ سیکھ رہی ہوں۔ میں اس وقت صرف بائیس سال کی تھی اور وہ باون سال کا تھا۔ مجھے پہلے ہی کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی بہت تیز رفتاری سے گزرتی جارہی تھی، بہت کم وقت میں مجھے دنیا میں بہت کچھ دیکھنے کو مل رہا تھا۔ کبھی کبھی تو میں زندگی کی تیز رفتاری پر چکرا سی جاتی تھی۔ مختلف ملاقاتوں میں کیری گرانٹ نے مجھے اپنی نجی اور پیشہ ورانہ زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔

وہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں بہت کامیاب تھا۔ بطور اداکار وہ 52 سال کی عمر میں بھی اپنے کیریئر کی بلندیوں پر تھا اور اب بھی مزید بہت سی کامیابیوں کی توقع رکھتا تھا۔ نجی زندگی میں صورتحال یہ تھی کہ ان دنوں اس کی تیسری شادی چل رہی تھی اور اس میں بھی حالات خوشگوار نہیں تھے۔ اس کا بچپن بھی خوشگوار نہیں گزرا تھا لیکن اس کی یہ عادت ذرا منفرد تھی کہ وہ دل کو اداس کردینے والی بہت سی باتیں بھی نہایت سرسری سے انداز میں بتاتا چلا جاتا تھا۔ وہ اپنے دل کے دکھ درد کو اپنے لہجے پر غالب آنے نہیں دیتا تھا۔ شاید وہ خیال رکھتا تھا کہ اس کی باتیں سن کر سامنے والا انسان اداس نہ ہو۔

اس نے بتایا کہ وہ چھوٹا ہی تھا جب اس کا بڑا بھائی مرگیا، اس کی ماں اس صدمے سے کبھی نجات نہیں پاسکی۔ اس نے اس حد تک اس صدمے کو اپنے اوپر طاری کیا کہ رفتہ رفتہ وہ پاگل پن کی آغوش میں چلی گئی۔ کیری گرانٹ نے اس بارے میں بات جاری رکھتے ہوئے بتایا۔ ”میں اس وقت شاید دس سال کا تھا، ایک روز میں گھر آیا تو میں نے ماں کو گھر میں موجود نہیں پایا۔ ڈیڈی نے مجھے بتایا کہ وہ مرچکی ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ڈیڈی نے انہیں پاگل خانے میں داخل کرادیا تھا۔ یہ بات مجھے کئی سال بعد جاکر معلوم ہوئی۔ اس کے بعد مجھے جب بھی موقع ملا، میں ان سے ملنے پاگل خانے جاتا رہا۔“

اس تصور سے میرے دل میں درد کی لہر سی اٹھی کہ دس سال کی عمر میں اس قسم کے صدمے سے گزرنا ایک بچے کے لئے کیسا تجربہ ہوگا؟ دس سال کی عمر میں تو انسان اس قسم کے صدمات کو صحیح معنوں میں سمجھ بھی نہیں سکتا۔ کیری اتنا بتاکر خاموش ہوگیا تھا۔ میں نے اس سے التجا کی کہ وہ مجھے اپنی زندگی کے بارے میں اور بھی کچھ بتائے۔ وہ مزید کچھ لمحے یوں خاموش رہا جیسے سلسلۂ کلام جوڑنے کے لئے موزوں الفاظ ڈھونڈ رہا ہو، پھر اس نے بتایا ”ڈیڈی نے مجھے ایک اچھے بورڈنگ اسکول میں داخل کرادیا لیکن میرا دل پڑھائی یا اسکول میں نہیں لگتا تھا، میرا دل چاہتا تھا کہ دوسرے بچوں کی طرح میں بھی ایک ایسے گھر میں رہوں، جہاں ماں باپ، بہن بھائی سب ہوں۔“

پھر وہ ایک شخص سے جا ٹکرایا جو چھوٹے سے ایک سرکس کا مالک تھا۔ اس کا نام باب پینڈر تھا۔ وہ اس کے لئے باپ بھی بن گیا اور استاد بھی۔ کیری اس کے ساتھ شہر شہر کے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ اس زمانے میں اس قسم کا تھیٹر بھی سرکس کا حصہ ہوتا تھا، جسے نوٹنکی کہا جاسکتا ہے۔ کیری نے اس سرکس کے ساتھ رہتے ہوئے اسٹیج پر اداکاری کرنے اور بہت سے کرتب سیکھنے کے ساتھ ساتھ زندگی گزارنا اور دنیا کا سامنا کرنا بھی سیکھ لیا۔ نیویارک پہنچ کر اس نے براڈوے میں کام کیا، جہاں اس کا برطانوی لہجہ بھی تبدیل ہوا۔ پھر وہ ہولی وڈ چلا گیا۔ کچھ عرصے کی تگ و دو کے بعد اسے پیراماؤنٹ پکچرز والوں نے تھوڑا بہت کام دینا شروع کردیا۔ وہیں اس نے اپنا نام کیری گرانٹ رکھا، ورنہ اس کا اصل نام آرچی لیچ تھا۔

کیری زیادہ تر شگفتہ انداز میں گفتگو کرتا تھا۔ ہنسی مذاق بھی کرتا رہتا تھا۔ اس نے کئی مزاحیہ فلموں میں بھی کام کیا تھا، اس قسم کے اداکاروں کو دیکھ کر اور ان سے مل کر شاید کسی کو گماں بھی نہیں گزرتا کہ ان کی یادوں کے نہاں خانوں میں کیسے کیسے دکھ دفن ہیں۔ تاہم وہ اپنے ماضی کی بہت زیادہ گہرائی میں نہیں جاتا تھا۔ شاید اسے خیال آجاتا تھا کہ وہ ہولی وڈ کا ایک سپر اسٹار ہے، کہیں اس کے منہ سے نکلی ہوئی کوئی بات کسی اور رنگ میں لوگوں تک نہ پہنچ جائے۔ ہم دونوں میں شاید کچھ باتیں مشترک بھی تھیں۔ رفتہ رفتہ ہم دونوں ہی کو کچھ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہماری دوستی محبت میں ڈھل رہی ہے۔

مارلن برانڈو کے ساتھ

کم از کم کیری گرانٹ کی حد تک تو ایسا ہی محسوس ہونے لگا تھا، البتہ میں اپنے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ میرا کارلو سے تعلق مضبوط ہوچکا تھا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس تعلق کا انجام کیا ہوگا۔ وہ میرا سب کچھ تھا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہمارا تعلق ابھی تک واضح اور اعلانیہ نہیں تھا۔ اس کی شادی ابھی تک برقرار تھی۔ اٹلی میں طلاق آسانی سے نہیں ہوتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کارلو کب مجھ سے شادی کرسکے گا؟ کر بھی سکے گا یا نہیں؟ کب ہم علی الاعلان میاں بیوی کی حیثیت سے رہ سکیں گے؟

کیری گرانٹ کی تیسری بیوی کا نام بیٹسی ڈریک تھا۔ وہ کبھی کبھار فلم کے سیٹ پر بھی آتی جاتی رہتی تھی۔ تاہم میاں بیوی میں ناچاقی چل رہی تھی۔ اسپین سے جب وہ آخری بار امریکا واپس روانہ ہوئی تو بحری جہاز میں سفر کررہی تھی۔ بدقسمتی سے وہ بحری جہاز ڈوب گیا، اس کے 46 مسافر بھی ڈوب گئے، لیکن بیٹسی خوش قسمت تھی کہ اس کا صرف سامان اور زیورات ڈوبے، وہ زندہ سلامت لاس اینجلس پہنچ گئی لیکن کیری، فلم کی شوٹنگ کی وجہ سے اس کے پاس نہیں جاسکا۔

فارغ وقت میں ہماری ملاقاتیں جاری تھیں لیکن یہ غنیمت تھا کہ ہم الگ ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس سے مجھے اپنے اور اس کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ برقرار رکھنے میں مدد مل رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے پوچھتا کہ میں کیسے گھر اور کیسے جیون ساتھی کا خواب دیکھتی تھی؟ اپنے ہونے والے بچوں کے نام کیا رکھنا چاہتی تھی؟ میں اپنے جوابات، اپنے رویئے اور اپنی باتوں سے پوری پوری کوشش کرتی کہ اس کے دل میں زیادہ امیدیں نہ جگاؤں۔ مجھے وہ اچھا ضرور لگتا تھا لیکن میں اس کے اور کارلو کے درمیان پھنس کر رہ گئی تھی۔

میں صرف دو مختلف مردوں کے درمیان نہیں بلکہ دو مختلف دنیاؤں کے درمیان پھنس کر رہ گئی تھی۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ میں شادی کے بغیر کارلو کے ساتھ زندگی بھر تو نہیں رہ سکتی تھی اور شادی کے فی الحال کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کے باوجود کارلو سے تعلق توڑنے کو نہ تو میرا دل مانتا تھا اور نہ ہی مجھ میں اتنی ہمت تھی۔ مجھے اس سے صرف محبت ہی نہیں تھی، وہ میری پناہ گاہ بھی تھا۔ کیری گرانٹ سے میری بڑھتی ہوئی دوستی کے افسانے اس تک بھی پہنچ رہے تھے، لیکن اس نے ابھی تک اس موضوع پر ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ اس اعتبار سے بھی وہ عام مردوں سے بہت مختلف تھا۔ اسے گویا اپنی محبت پر اندھا اعتماد تھا۔

میرے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ ہولی وڈ میرا خواب ضرور تھا لیکن میں مستقل طور پر امریکا منتقل ہونا اور وہاں آباد ہونا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ زیادہ تر اطالوی بڑے روایت پرست ہوتے ہیں اور اپنی مٹی میں ان کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں، وہ بڑی مشکل سے، یا پھر کسی مجبوری کے تحت کسی دوسرے ملک میں آباد ہوتے ہیں اور اگر ہو جاتے ہیں تب بھی ان کی روح اپنے وطن میں ہی رہتی ہے۔ دوسری طرف کیری گرانٹ جیسے آدمی کی شخصیت میں جو مقناطیسیت پنہاں تھی، اس سے اپنے آپ کو بچانا بھی مجھ جیسی ناتجربہ کار اور پرجوش لڑکی کے لئے بڑا مشکل کام تھا۔ بہرحال وقت خود ہی ہمیں کسی فیصلے کی طرف لے جارہا تھا۔ اسپین میں فلم کی شوٹنگ ختم ہورہی تھی ہم نے چھ ماہ وہاں گزارے تھے۔

اسپین میں ہمارے قیام کی آخری رات کو بھی اس نے مجھے باہر کھانے پر مدعو کیا۔ اس رات وہ معمول سے زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہم کھلی چھت کی گاڑی میں دیہی علاقے کی ایک سڑک پر جارہے تھے، جب اس نے بلاتمہید اور بالکل اچانک مجھ سے پوچھا۔ ”صوفیہ! کیا تم مجھ سے شادی کرسکتی ہو؟ تمہاری خاطر میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔“

مجھے اس سوال کی توقع ضرور تھی، اس کے باوجود نہ جانے کیوں میں اس کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس لمحے میں نے اپنے آپ کو ایسی اداکارہ محسوس کیا جو کسی فلم کے سیٹ پر اپنے مکالمے بھول گئی ہو۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے کبھی اس حد تک اس کی ہمت افزائی نہیں کی تھی کہ اس سوال کی نوبت آتی۔ میں اب بھی اسے اس قسم کی کوئی امید دلانا نہیں چاہتی تھی۔

میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں، بیٹھی بیٹھی سی آواز میں کہا ”کیری ڈیئر! مجھے سوچنے کے لئے وقت چاہئے۔“

میرے سامنے اس کی شخصیت بہت بلند و بالا تھی، میں اپنے آپ کو اس کے مقابل بہت چھوٹی محسوس کررہی تھی۔ عمر کے اعتبار سے نہیں، بلکہ مقام و مرتبے اور شخصیت کے اعتبار سے۔

اس کے لئے میرا جواب یقیناً ایک دھچکے سے کم نہیں تھا لیکن وہ بہ خوبی اس دھچکے کو سہ گیا اور اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں بولا۔ ”کیوں نہ ہم شادی پہلے کرلیں اور سوچیں بعد میں؟“

بہرحال، بات وہیں ختم ہوگئی۔ دوسری صبح میں یونان روانہ ہوگئی، جہاں مجھے اپنی دوسری امریکی فلم ”بوائے آن اے ڈولفن“ (Boy On A Dolphin) کی شوٹنگ شروع کرنی تھی۔ میں جب ایتھنز پہنچی تو وہاں میرے ہوٹل کے کمرے میں ایک گلدستہ پہلے سے موجود تھا اور اس کے ساتھ ایک لفافے میں زرد رنگ کا رقعہ تھا، جس پر کیری نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا:

مجھے معاف کردینا پیاری لڑکی! میں نے تم پر بہت زیادہ سوچ بچار کا بوجھ ڈال دیا۔ میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا ہرگز نہیں تھا۔ آؤ، اپنے اپنے اچھے مستقبل کے لئے دعا کریں۔ خدا حافظ صوفیہ۔

(جاری ہے)

اُس نے بھرے جہاز میں مجھے تھپڑ رسید کردیا

تمکین تبسم

قسط : 15

کیری گرانٹ کے ساتھ میری محبت تو پروان نہیں چڑھ سکی لیکن ہم زندگی بھر ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست رہے۔ ہمارے درمیان ایک خواب مشترک تھا...... اور وہ تھا، ایک ہنستے بستے گھر کا خواب......! ایک ایسا گھر جس میں میاں بیوی مجبوراً نہیں بلکہ محبت کے رشتے میں بندھ کر رہ رہے ہوں۔ اس خواب نے مجھے اور کیری کو ہمیشہ دوستی کے بندھن میں باندھے رکھا۔ جب کارلو پونٹی سے میری شادی ہوگئی اور میرے ہاں یکے بعد دیگرے دو بیٹوں کی پیدائش ہوئی تو کیری نے بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔

اسی طرح جب برسوں بعد کیری کی چوتھی شادی کے بعد اس کے ہاں بیٹی جینفر پیدا ہوئی تو میں نے بھی بے پناہ خوشی محسوس کی۔ کیری برسوں سے اولاد کے لئے تڑپ رہا تھا۔ اس کی بیوی بار بار اسے مل کر بھی مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ کیری کی چوتھی شادی بہرحال کامیاب رہی تھی۔ ان میاں بیوی کے درمیان واقعی محبت تھی۔ بعض لوگوں کو زندگی بھر بھٹکنے کے بعد عمر کے آخری حصے میں محبت نصیب ہوتی ہے۔ کیری انہی لوگوں میں سے تھا۔

اس کے تذکرے کو یہیں چھوڑ کر میں ان دنوں کی طرف واپس آتی ہوں، جب اس نے مجھے الوداعی خط لکھا تھا اور ہمارے راستے جدا ہوگئے تھے۔ اس کے بعد میں نے مزید دو امریکی فلموں میں کام کیا لیکن یہ فلمیں میں نے امریکا سے باہر رہتے ہوئے ہی کی تھیں۔ ان کی شوٹنگ یونان، اسپین اور لیبیا میں ہوئی۔ ان فلموں نے مجھے تھکا دیا۔ میں نے ہولی وڈ کی تین فلمیں کرلی تھیں، لیکن ابھی تک میں نے ہولی وڈ میں قدم نہیں رکھا تھا۔

صوفیہ، مائیکل جیکسن

آخر کار 6 اپریل 1967ء کو مجھے باقاعدہ طور پر ہولی وڈ روانہ ہونا پڑا۔ مما مجھے خدا حافظ کہنے جہاز کی سیڑھی تک آئیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں ایک غیر معینہ مدت کے لیے ان سے جدا ہو کر ایک اجنبی ملک جارہی تھی۔ میری بہن ماریا میرے ساتھ جارہی تھی۔ مما کی آنکھوں میں آنسو تھے اور میرے لیے ان کی لاتعداد نصیحتوں کا سلسلہ جاری تھا۔

لاس اینجلس کے ایئرپورٹ پر اترتے وقت صرف ماریا ہی نہیں، میں بھی حیران رہ گئی۔ وہاں ہمارے استقبال کے لیے ہزاروں افراد موجود تھے، جن میں ہولی وڈ کی بڑی بڑی شخصیتیں بھی شامل تھیں۔ میں اور ماریا چکرا کر رہ گئیں۔ مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں اتنی مشہور ہوچکی ہوں۔ ہمیں یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ میں اسی قسم کی کامیابیوں کے خواب دیکھا کرتی تھی لیکن اب جبکہ مجھے وہ کامیابیاں حاصل ہونے لگی تھیں تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

امریکا میں مجھے کارلو پونٹی کے ساتھ زیادہ رہنے کا موقع ملا لیکن وہ اب بھی اٹلی اور امریکا کے درمیان تقسیم تھا۔ اس کی فیملی اٹلی میں تھی۔ وہ روم اور لاس اینجلس کے درمیان سفر کرتا رہا۔ اس نے پیراماؤنٹ اسٹوڈیوز سے میرے بارے میں معاہدہ کرلیا تھا۔ پیراماؤنٹ والوں نے ہی مجھے شاہانہ انداز میں پورے ہولی وڈ اور میڈیا سے متعارف کرانے کے لیے بیورلے ہلز کے ایک عالیشان ریسٹورنٹ میں ایک پارٹی کا اہتمام کیا، جہاں میں نے اس وقت کے، ہولی وڈ کے بہت سے سپر اسٹارز کو پہلی بار حقیقت میں دیکھا اور عین ان کے سامنے بیٹھ کر دیکھا۔

اس کے بعد تو پارٹیوں کا سلسلہ ہی شروع ہوگیا۔ مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے میں بہت تیزی سے گھومنے والے کسی جھولے میں بیٹھی ہوں اور مناظر بہت تیزی سے میرے سامنے سے گزرتے چلے جارہے ہیں۔ ہولی وڈ میں زندگی واقعی بہت تیز رفتار تھی۔ وہاں سپر اسٹارز کے بڑے بڑے، عالیشان، محل نما مکانات تھے، چم چم کرتی بڑی بڑی گاڑیاں تھیں، روشنیاں، ہنگامے اور موسیقی تھی۔ کاک ٹیل پارٹیاں تھیں۔ میں واقعی اٹلی کے ایک چھوٹے سے قصبے سے نکل کر شاید کسی پرستان میں آگئی تھی۔ کبھی کبھی میں اور ماریا ایک دوسرے کو چٹکی کاٹ کر پوچھتیں کہ کہیں ہم دونوں خواب تو نہیں دیکھ رہے؟ پھر ہم دونوں ہنس دیتیں۔

ایک ہوٹل کے نہایت شاندار سوئٹ میں ہم دونوں کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا، جس کی بالکونی بہت بڑی تھی اور وہاں سے شہر کا خوبصورت نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ مجھے سب سے پہلے، اس زمانے کے مقبول ترین ٹی وی شو ''دی ایڈ سلیوان شو'' میں مدعو کیا گیا۔ اس زمانے میں فلمی دنیا کے سب سے زیادہ اسکینڈلز سامنے لانے والی صحافی ہیڈا ہوپر تھی، جس سے اداکار ڈرتے تھے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ میرے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ تھا۔ شاید میں اس کی نظر میں ابھی ایک سیدھی سادی، نیم دیہاتی لڑکی تھی جو دوسرے ملک سے آئی تھی۔

ہولی وڈ پہنچنے کے بعد میری پہلی امریکی فلم Desire Under The Elm تھی۔ یہاں مجھے کیری گرانٹ کے ساتھ ایک شستہ قسم کی کامیڈی فلم Houseboat میں بھی کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ لاس اینجلس میں رہنے کی وجہ سے ویسے بھی کیری سے دوبارہ ملاقاتیں شروع ہوگئی تھیں۔ ایک روز میں اور کارلو ہوٹل کی ٹیرس پر بیٹھے ناشتا کررہے تھے۔ میں ساتھ ساتھ اخبار بھی دیکھ رہی تھی۔ اچانک ایک خبر پر میری نظر پڑی اور اخبار میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ اس خبر کی سرخی کا مفہوم یہ تھا کہ کارلو پونٹی اور صوفیہ لورین نے میکسیکو میں خفیہ شادی کرلی ہے۔

قصہ اصل میں یہ تھا کہ میں اور کارلو پونٹی اکثر اپنی الجھن کا حل تلاش کرتے رہتے تھے اور وہ الجھن یہ تھی کہ ہم شادی کیسے کریں؟ امریکا میں شادی اور طلاق بہت آسان تھی۔ میکسیکو میں اس سے بھی زیادہ آسان تھی۔ وہاں تو دولہا اور دلہن کی عدم موجودگی میں ان دونوں کے وکیل بھی ان کی شادی کرادیتے تھے۔ کارلو پونٹی نے اپنے وکیلوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ ہماری شادی کے لیے کوئی ایسا ہی راستہ تلاش کریں لیکن انہوں نے کچھ ایسی مستعدی دکھائی تھی کہ ہماری غیر موجودگی میں ہی ہماری شادی کرادی تھی اور یہ خبر لوئیلا پارسن نامی ایک خاتون صحافی کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ کارلو کے وکیلوں نے خود کارلو کو بھی اس بات کی اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ وہ کم از کم کاغذات کی حد تک ہماری شادی کراچکے ہیں۔

امریکا اور دوسرے بہت سے ممالک میں تو یہ شادی قانونی تھی لیکن ہمارے اپنے ملک اٹلی میں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہاں تو اس کی وجہ سے الٹا ہمارے لیے بہت سے مسائل کھڑے ہوسکتے تھے۔ میں نے اس قسم کی شادی کا خواب نہیں دیکھا تھا لیکن بہرحال...... جو ہونا تھا، وہ ہوچکا تھا، کچھ اور تو اب ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ اس رات ہم نے اس ''خوشی'' میں ایک ریسٹورنٹ میں، خوبصورت سی جگہ پر بیٹھ کر موم بتیوں کی رومانی سی روشنی میں کھانا کھایا۔ یہ ہماری ''شادی کا کھانا'' تھا، جس میں صرف ''دولہا دلہن'' شریک تھے۔

دوسرے روز فلم ''ہاؤس بوٹ'' کے سیٹ پر کیری گرانٹ نے مجھے شادی کی مبارکباد اور آئندہ زندگی خوشگوار گزرنے کی دعا دی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس سیٹ پر، فلم کے سین میں میری شادی کیری گرانٹ سے ہورہی تھی۔

کارلو کے ساتھ میری کاغذی شادی کی وجہ سے ہمارے لیے مشکلات تقریباً ایک ماہ بعد شروع ہوئیں، جب یہ خبر اٹلی تک پہنچی۔ وہاں کے ایک اخبار نے، جس کی پشت پناہی کٹر مذہبی حلقے کرتے تھے، ہمارے خلاف ایک زوردار مضمون چھاپ دیا۔ اس کے بعد ایک خاتون، جسے ہم نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا، ہمارے خلاف سرگرم ہوگئی۔

وہ عورتوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والی کسی گمنام سی تنظیم کی سربراہ تھی لیکن دو نامور افراد کے خلاف سرگرم ہونے سے ان کی تنظیم کو مفت میں خاصی شہرت ملنے لگی۔ میرے اور کارلو کے، شادی سے پہلے جس طرح تعلقات تھے اور پھر جس طرح ہماری شادی ہوئی، یہ دونوں ہی چیزیں اٹلی میں ان دنوں جرم تھیں اور 1969ء تک جرم ہی رہیں۔

ادھر اٹلی میں ہمارے خلاف مہم چل رہی تھی، بیان بازیاں ہورہی تھیں، ادھر مجھے اور کارلو کو لندن روانہ ہونا پڑا، جہاں مجھے فلم The Key کی شوٹنگ میں حصہ لینا تھا۔ ہم جہاز میں سوار ہوئے تو ایئر ہوسٹسوں اور رپورٹرز تک نے ہم سے شادی کے بارے میں سوالات کرنے شروع کردیے۔ ہم اپنے مسائل اور مصروفیات کی وجہ سے پہلے ہی اعصابی تناؤ کا شکار تھے لیکن حتی الامکان سکون اور صبر و ضبط سے سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کررہے تھے۔

اپنی نشستوں پر بیٹھ جانے کے بعد جب ہم دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے تو برسبیل تذکرہ میں نے کارلو سے کہا۔ ''کل مجھے کیری نے زرد پھولوں کا گلدستہ بھیجا ہے۔ زرد رنگ حسد اور رقابت کی علامت نہیں ہوتا؟'' میں نے یہ سوال باتوں باتوں میں، بالکل معصومیت سے کیا تھا، لیکن کارلو نے نہ جانے اس سے کیا اثر لیا، اس نے اچانک اور قطعی غیر متوقع طور پر میرے منہ پر تھپڑ رسید کردیا۔ بھرے جہاز میں، سب کے سامنے تھپڑ کھا کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ شرم اور خجالت سے میرے رخسار تپ اٹھے۔ پہلے تو میرا جی چاہا کہ فوراً طیارے سے اتر جاؤں لیکن نہ جانے کس طاقت نے مجھے اٹھنے نہ دیا۔

شاید کارلو سے میرے تعلق کا وہ آخری دن ہوتا اور آج میں اپنی جو داستانِ حیات لکھ رہی ہوتی، وہ اس سے کافی مختلف ہوتی جو آپ پڑھ رہے ہیں۔ میری عمر اس وقت 23 سال تھی۔ اس عمر میں لہو آتش سیال بن کر رگوں میں دوڑتا ہے اور انسان زیادہ تر فیصلے دماغ سے نہیں بلکہ دل سے کرتا ہے، لیکن نہ جانے کیوں اس وقت میرے دل و دماغ میں اٹھنے والا ابال چند سیکنڈ میں ہی کافی حد تک بیٹھ گیا اور میں اس معاملے کو ایک بالکل ہی مختلف زاویے سے دیکھنے لگی۔

میں نے سوچا، اتنے عرصے سے کارلو میری اور کیری گرانٹ کی میل ملاقات کے بارے میں سن رہا تھا، لیکن اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ردعمل اس کے دل میں جمع ہورہا تھا۔ اگر آج اس کا یہ ردعمل آج اس کی برداشت سے باہر ہوگیا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بہرحال مجھ سے محبت کرتا تھا، اس کے دل میں بھی حسد و رقابت کے جذبات موجود تھے، جنہیں وہ اب تک اعلیٰ ظرفی کے اظہار کے لیے، چھپائے بیٹھا تھا۔ جب میں اس نتیجے پر پہنچ گئی تو میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہ رہا کہ مجھے اسی شخص سے شادی کرنی تھی۔ ابھی خواہ اس سے میری کاغذی شادی ہوئی تھی لیکن اگر باقاعدہ اور باضابطہ شادی کی بھی نوبت آئے تو وہ بھی مجھے اسی شخص سے کرنی ہوگی اور اسی کے ساتھ زندگی گزارنی ہوگی۔

انسانی ذہن بعض اوقات عجیب حالات میں، عجیب فیصلے کرتا ہے۔ بہرحال مجھے آج تک اس بات کی خوشی ہے کہ میں نوجوانی اور ناتجربہ کاری کے اس دور میں درست فیصلہ کرنے میں کامیاب رہی۔ آگے چل کر کارلو سے میری شادی کامیاب رہی اور ہم نے ایک مطمئن، مسرور اور آسودہ زندگی گزاری۔ میرا انتخاب غلط نہیں تھا لیکن اگر اس روز اس کا تھپڑ کھا کر میں جہاز سے اتر گئی ہوتی تو میری زندگی کی کہانی نہ جانے کیا ہوتی۔ کارلو نے اس روز مجھے زندگی کا پہلا اور آخری تھپڑ مارا لیکن اس کے بعد اس نے مجھے زندگی کی ان گنت خوشیاں دیں۔ صرف یہی نہیں، وہ اپنے اس روز کے طرز عمل پر ہمیشہ شرمندہ بھی رہا۔

1958ء میں مجھے The Black Orchid میں انتھونی کوئین کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ انتھونی کوئین کا بچپن اور لڑکپن بھی ہولی وڈ کے کئی دوسرے ممتاز اداکاروں کی طرح کچھ زیادہ خوشگوار نہیں گزرا تھا، جس کی وجہ سے اس کے مزاج میں بھی کچھ ٹیڑھا پن پیدا ہوگیا تھا۔ مجھے نئی اور کم عمر اداکارہ سمجھتے ہوئے اس نے شروع میں میرے ساتھ کچھ کھردرا رویہ اختیار کرنے کی کوشش کی اور میرے کام میں بھی کیڑے نکالنا چاہے۔ میں نے اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھتے ہوئے پوری خود اعتمادی سے اس کے ساتھ بات کی تو رفتہ رفتہ وہ سیدھا ہوگیا اور ہمارے درمیان خاصے خوشگوار مراسم استوار ہوگئے۔

''دی بلیک آرچڈ'' پر مجھے وینس فلم فیسٹیول میں پہلا ایوارڈ ملا۔ جس وقت ایوارڈ کا اعلان ہوا، میں ایک اور فلم Olympia کی شوٹنگ کے لیے آسٹریا میں تھی۔ یہ فلم امریکا اور دیگر ممالک میں A Breath of A Scandal کے نام سے ریلیز ہوئی تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں اپنی زندگی کا پہلا ایوارڈ لینے خود اپنے وطن جاؤں۔ میں نے کارلو سے بات کی کہ وہ بھی میرے ساتھ چلے لیکن اس نے مجھے بتایا کہ اگر ہم دونوں اکٹھے اٹلی گئے تو ہمیں گرفتار کرلیا جائے گا۔ چنانچہ مجھے تنہا ہی اٹلی کے شہر وینس جانا پڑا جہاں ہزاروں افراد نے میرا استقبال کیا۔ وہ نعرے لگا رہے تھے ''ویلکم ہوم صوفیہ!''

(جاری ہے)

صوفیہ لورین کی داستانِ حیات

شوبز کے زیادہ تر لوگ سچی خوشی سے محروم رہتے ہیں

میں اور کارلو کبھی کسی فلم کے سلسلے میں، کبھی کاروباری معاملات کی وجہ سے اور کبھی چھٹیاں منانے کے لئے دنیا بھر کے خوبصورت اور مشہور مقامات پر جاتے رہتے تھے۔ بڑی بڑی شخصیات سے ہماری ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی مشہور عالم شخصیات ہمارے پاس پڑوس میں ہی مقیم ہوتی تھیں۔ ہم شاہانہ انداز میں سفر کرتے تھے اور ہمارا

1962ء میں کانز فلم فیسٹیول میں آمد

"میرج اٹالین اسٹائل" میں مارسیلو کے ساتھ

تمکین تبسم

قیام وطعام بھی شاہانہ ہوتا تھا۔ ہمیں دنیا بھر کی آسائشیں میسر ہوتی تھیں۔ ہم ان سب چیزوں سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے۔ اس کے باوجود ایک قسم کی بے اطمینانی اور ناآسودگی ہمارے ساتھ سفر کرتی تھی۔ ہمارا گویا دنیا میں کہیں کوئی گھر نہیں تھا۔ ہم اپنے آپ کو بے گھر محسوس کرتے تھے۔

اس دوران میں نے ایک بار پھر انتھونی کوئین کے ساتھ کام کیا۔ ہم Heller In The Pink Tights میں ایک بار پھر یکجا ہوئے۔ اس کے علاوہ میں نے پہلی بار کلارک گیبل کے ساتھ It Started In Naples میں کام کیا، جس کیلئے مجھے اپنے وطن جانا پڑا۔ کلارک گیبل کا اس وقت بڑا نام تھا اور وہ نہایت دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ میں جب بھی ان کی طرف دیکھتی، مجھے ان کی مشہور زمانہ فلم Gone with The Wind میں ان کا کردار اور پرفارمنس یاد آجاتی۔ میں تو سینما ہال میں بیٹھ کر ان کی فلمیں سحر زدہ ہو کر دیکھا کرتی تھی۔ اس وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک روز میں ان کے ساتھ کام کروں گی، ان کے مقابل کھڑی ہو کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مکالمے بولوں گی۔ وہ ایک نہایت نفیس آدمی تھے۔ ہر چیز کو بے عیب دیکھنے اور ہر کام کو بے عیب طریقے سے کرنے کے عادی تھے۔ نظم وضبط کے بھی پابند تھے۔ ہمیشہ وقت پر شوٹنگ کے لئے پہنچ جاتے تھے۔ شام کو ٹھیک پانچ بجے ان کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کا مدہم سا الارم بج اٹھتا تھا اور اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ اب وہ جا رہے ہیں تو جس کی شوٹنگ جہاں تک پہنچی ہے، وہیں چھوڑ کر چلے جائیں۔

فروری 1962ء میں مجھے فلم Two Women پر آسکر ایوارڈ ملا تو میرے لئے اس پر یقین کرنا مشکل ہو گیا۔ میں اور آسکر ایوارڈ......؟ یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ جس فلم پر مجھے آسکر ملا تھا، وہ اطالوی تھی۔ بہر حال، یہ بہت بڑی خوشی تھی، جس نے مجھے احساس دلایا کہ میرا سفر کامیابی سے جاری تھا لیکن میں دل ہی دل میں ناکامیوں کے لئے بھی تیار رہتی تھی۔ میں اپنا آسکر وصول کرنے کے لئے تقریب میں نہیں گئی۔ کیونکہ میں نے صرف نامزدگی کی خبر سنی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر مجھے ایوارڈ نہ ملا تو میں مایوسی سے بے ہوش ہو جاؤں گی اور اگر مل گیا تو خوشی سے بے ہوش ہو جاؤں گی۔ ہزاروں حاضرین اور سیکڑوں کیمروں کے سامنے بے ہوش ہونا بہر حال مجھے گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ جب آسکر ایوارڈ کی تقریب ہو رہی تھی اور ایوارڈ دینے کے لئے میرا نام پکارا جا رہا تھا، اس وقت میں روم میں اپنے گھر کے لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز تھی۔ کارلو بھی اس وقت روم میں ہی تھا۔ وہ بڑا خطرہ مول لے کر آیا تھا کیونکہ اس کے خلاف یہاں دہری شادی کا مقدمہ بن چکا تھا۔ خطرہ تو میرے لئے بھی موجود تھا لیکن ہم دونوں زیادہ عرصے اپنے وطن سے دور بھی نہیں رہ سکتے تھے۔

تمام رات میں نے اور کارلو نے جس بے چینی اور اضطراب سے ایوارڈ کے فیصلے کا انتظار کیا، وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ اس زمانے میں ٹی وی پر لائیو نشریات نہیں ہوتی تھیں اور نہ ہی اس قسم کا نیٹ ورک تھا کہ لوگ بہت سے ممالک میں بیک وقت کوئی تقریب ٹی وی پر دیکھ سکتے۔ چنانچہ ہم نے وہ ساری رات جاگ کر گزاری۔ روم اور کیلیفورنیا کے وقت میں بھی خاصا فرق تھا۔ صبح منہ اندھیرے کیری گرانٹ کا فون آیا جو کارلو نے ریسیو کیا۔ کیری نے جب اسے یہ خبر دی کہ صوفیہ کو آسکر مل گیا ہے، تو وہ خوشی سے نعرے لگانے لگا اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے کیونکہ آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں مگر ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ اس فلم پر مجھے آسکر کے علاوہ مجموعی طور پر بیس ایوارڈز ملے۔ اس فلم کی کہانی میں میری اپنی حقیقی زندگی کی جھلک تھی۔ میں جب اس کے بارے میں سوچتی ہوں تو آج کم وبیش پچاس سال بعد بھی بہت سے دردناک لمحوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

بہر حال اس فلم نے مجھے بڑی خود اعتمادی بخشی۔ اب مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں ہر طرح کا رول کر سکتی ہوں۔ اداکاری کے مشکل ترین امتحان سے گزر سکتی ہوں۔ پھر 1960ء کی دہائی شروع ہو گئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس دہائی میں دنیا میں بڑی بڑی تبدیلیاں آئیں اور بڑے اہم واقعات رونما ہوئے۔ ہر شعبۂ زندگی میں کوئی نہ کوئی انقلاب آیا۔ اس دہائی میں موسیقی کی دنیا میں بیٹلز کا دور آیا۔ فلموں میں جیمز بانڈ آیا۔ امریکی صدر جان ایف کینیڈی قتل ہوئے۔ سیاہ فاموں کے حقوق کے لئے مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کی پرامن تحریک چلی اور دنیا بھر میں کتنے ہی دوسرے، نہایت اہم واقعات رونما ہوئے۔ میں بھی اس دوران بہت سی یادگار فلموں میں مصروف رہی، جن کی شوٹنگ کے لئے مجھے دنیا کے مختلف حصوں میں جانا پڑتا۔ میں اکثر حالت سفر میں رہتی لیکن امریکی فلموں میں تمام تر مصروفیت کے باوجود، مجھے جب بھی موقع ملتا میں اطالوی فلمیں ضرور کرتی۔

اس دہائی کے دوران، 1962ء میں ایک روز کارلو نے فون پر متاسفانہ انداز میں وہ خبر سنائی جس نے کافی دیر کے لئے مجھے سر سے پاؤں تک سن کر کے رکھ دیا۔ یہ مریلین منرو کی موت کی خبر تھی۔ خیال یہی ظاہر کیا گیا تھا کہ اس نے زیادہ تعداد میں خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی تھی۔ میریلین کی موت نے جہاں مجھے بے پناہ دکھ پہنچایا، وہاں بے حد تشویش کے ... کچھ سوچنے پر مجبور بھی ... اس عورت کے پاس کیا نہیں تھا؟ اسے دنیا کی حسین ترین عورت سمجھا جاتا تھا۔ دنیا میں نہ جانے کیسے کیسے لوگ اس کے طلب گار تھے۔ صدر امریکا تک اس کے چاہنے والوں میں تھے۔ عام لوگ تو اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے مرے جاتے تھے۔ دنیا کی ہر آسائش اسے میسر تھی۔ وہ شہرت کی انتہا پر تھی۔

ان سب کے باوجود اس نے اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا! اس کا مطلب تھا کہ سچی خوشی ان سب چیزوں میں بھی نہیں تھی۔ تو پھر سچی خوشی کہاں تھی؟ کس چیز میں تھی؟ شوبز کے لوگوں میں سے اکثر کو اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ لوگ ان کے ہنستے مسکراتے، دلکش چہروں کو دیکھتے ہیں، ان پر رشک کرتے ہیں۔ ان چہروں کے پیچھے چھپی ناآسودہ اور زخمی روحوں تک کسی کی نظر نہیں جاتی۔

اسی سال میں فلم "فال آف دی رومن ایمپائر" کی شوٹنگ کے لئے کافی عرصہ اسپین میں رہی۔ شوٹنگ کے دوران ہی چند دن کے لئے مجھے ہولی وڈ بھی آنا پڑا کیونکہ وہاں میرے ہاتھوں سے گریگوری پیک کو آسکر ایوارڈ دلوایا جانا تھا۔

1963ء میں، میں نیپلز میں فلم "ایڈلینا" کی شوٹنگ کر رہی تھی۔ اس میں میرا کردار ایک ایسی عورت کا تھا جو ماں بننا چاہتی ہے لیکن شوہر کی وجہ سے نہیں بن پاتی۔ فلم مزاحیہ تھی لیکن بات نہایت سنجیدہ تھی۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں امید سے ہوں۔ میرے بہت سے ٹیسٹ ہوئے۔ حتیٰ کہ روم سے ایک بہت ہی ماہر گائناکولوجسٹ کو بھی بلایا گیا جس نے ایک جیتے جاگتے مینڈک کے ذریعے میرا ایک ٹیسٹ لیا جو بجائے خود کسی مزاحیہ فلم کے سین سے کم نہیں تھا۔

ہر ٹیسٹ کی رپورٹ یہی آئی کہ میں امید سے نہیں ہوں مگر مجھے نہ جانے کیوں یہی محسوس ہوتا رہا کہ میں امید سے ہوں۔ شاید یہ میری لاشعوری خواہش کا اثر تھا۔ میری عمر اب 29 سال تھی اور میرا دل چاہتا تھا کہ اب میں ماں بن جاؤں۔ میرا دوست اداکار، ہدایتکار اور برسوں کا ساتھی ڈی سیکا کہا کرتا تھا کہ صوفیہ تو پیدائشی ماں ہے۔ آخر کار چند دن بعد میرا مزید ایک ٹیسٹ ہوا تو پتا چلا کہ میرا "وہم" ٹھیک تھا۔ میں واقعی امید سے تھی۔ میں اور کارلو بہت خوش تھے، لیکن ہمارا شادی کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا تھا۔ اٹلی میں ہم دونوں کا تعلق غیر قانونی تھا۔ وہاں ہمیں ابھی تک میاں بیوی تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔

شوٹنگز جاری تھیں۔ مزید کئی ہفتے گزر گئے۔ ڈاکٹروں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں کار میں سفر نہ کروں لیکن فلم میں میرا کار میں سفر کا ایک سین آ گیا۔ مجھے اصل سفر سے بچانے کے لئے کار کو ایک کرین پر رکھ کر جھوٹ موٹ چلتے ہوئے دکھایا گیا لیکن اس میں اتنے جھٹکے لگے کہ یہ کار میں اصل سفر کرنے سے زیادہ برا ثابت ہوا۔ اس روز ہوٹل واپس جاتے ہوئے مجھے شدید تکلیف ہوئی اور لفٹ میں پہنچ کر میں بے ہوش ہو کر گر گئی۔ جب میں ہوش میں آئی تو مجھے پتا چلا کہ میرا ماں بننے کا خواب، محض خواب ہی رہ گیا تھا۔ اس واقعے نے مجھے اندر ہی اندر توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی بہت بڑی خوشی میرے ہاتھوں میں دے کر مجھ سے چھین لی گئی۔ بہت دنوں کے لئے مجھے چپ سی لگ گئی۔ میرا کسی سے بات کرنے کو جی نہ چاہتا۔ میرے اندر کہیں، شاید میری روح میں ایک احساس تنہائی اور سناٹا پھیل گیا تھا۔ تاہم میں کام پر واپس آ گئی تھی اور بظاہر تمام معمولات دوبارہ اسی طرح شروع ہو گئے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے ساتھ جو ہوا، اس کی وجہ کرین پر رکھی ہوئی کار میں سین شوٹ کرانا نہیں تھا بلکہ میرے ہارمونز میں کچھ گڑبڑ تھی۔ چار سال بعد ایک بار پھر میں اسی طرح ماں بنتے بنتے رہ گئی۔ ان دنوں میں More Than A Miracle کی شوٹنگ کر رہی تھی جس میں عمر شریف بھی میرے ساتھ تھے۔ اس مرتبہ میں نے ہر ممکن احتیاط بھی کی تھی...... بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ میں نے احتیاط کی انتہا کر دی تھی۔ ایک بہترین گائناکولوجسٹ میری نگرانی کر رہا تھا اور میں مستقل طور پر بستر پر لیٹ گئی تھی۔ میں نے ہر کام چھوڑ دیا تھا۔

جب مجھے پہلے ہی کی طرح شدید تکلیف شروع ہوئی تو میرے دل نے کہہ دیا کہ میں ایک بار پھر پہلے والے تجربے سے گزرنے لگی ہوں، لیکن "نہایت قابل" ڈاکٹر صاحب کسی بات کو کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ مجھے ایمرجنسی میں اسپتال لے جایا گیا اور "قابل" ڈاکٹر صاحب مجھے بے پروائی سے تسلی دے کر اور نیند کی دوا دے کر ایک کاک ٹیل پارٹی میں چلے گئے۔ موصوف کو کاروں کی ریس میں حصہ لینے کا بھی شوق تھا اور کبھی کبھی ہیلمٹ پہن کر ہی اسپتال آ جاتے تھے۔ میں ایک بار پھر ایک اذیت ناک تجربے سے گزری۔

دوسری صبح میرے ہوش میں آنے پر ڈاکٹر صاحب نے نہایت اطمینان سے مجھے گویا "خوشخبری" سنا دی "سینورا! بے شک آپ ایک صحت مند جسم اور حسین چہرے کی مالک ہیں لیکن آپ زندگی میں کبھی ماں نہیں بن سکیں گی۔"

اس کے الفاظ نے میری روح پر خراشیں ڈال دیں۔ میری ذات اندر سے گویا کھنڈر ہو گئی اور اس کھنڈر میں مایوسی کا گہرا سناٹا پھیل گیا۔ کارلو جیسے مضبوط آدمی کو بھی اس جھٹکے نے ہلا کر رکھ دیا اور وہ کئی دنوں تک سب کچھ بھول بھال کر گم صم رہا۔ میں نے ماں بننے کی امید چھوڑ دی اور ایک بار پھر اپنے آپ کو کام میں الجھا کر اپنے اس دکھ کو ذہن کے کسی تاریک گوشے میں دفن کرنے کی کوشش کی۔ اسی دوران کسی کے ذریعے مجھے ایک ڈاکٹر کا پتا چلا، جس کا کلینک سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا میں تھا۔ اس نے مجھ جیسے مسئلے کا شکار ہونے والی بہت سی خواتین کا علاج کیا تھا اور ان کے ہاں اولاد ہوئی تھی۔

(جاری ہے)

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ چارلی چپلن میرے گھر آئے ہیں

تمکین تبسم

قسط : 17

میں اس سے جا کر ملی۔ وہ مجھے ڈاکٹر سے زیادہ ایک بے حس، سرد مزاج بیورو کریٹ لگا۔ میرے خیال میں اس کے دل میں جذبۂ ہمدردی کی رمق بھی موجود نہیں تھی لیکن آگے چل کر میرے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ مجھے پتا چلا کہ اندر سے وہ ایک نہایت حساس اور ہمدرد انسان تھا۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی، لیکن اس نے شاید اپنی اس کمی کو اپنے پیشے میں سمو دیا تھا۔ اس کے علاج کے بعد جو بچے اس دنیا میں آتے تھے، وہ انہیں اپنے ہی بچوں کی طرح سمجھتا تھا۔

جب میں 1968ء میں تیسری بار امید سے ہوئی تو میں نے جنیوا جا کر ڈاکٹر کے کلینک کے قریب ہی ایک ہوٹل میں کمرا لے لیا اور وہاں لیٹ گئی۔ ڈاکٹر نے میرے بہت سے ٹیسٹ لئے اور آخر میں اطمینان سے مجھے بتایا۔ ”آپ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آپ میں صرف ایسٹروجن ہارمون کی کمی ہے جس کی وجہ سے آپ کا ماں بننے کا عمل بہ خیر و عافیت مکمل نہیں ہو پاتا۔ ہم آپ کو اس ہارمون کے چند طاقتور انجکشن لگائیں گے اور دسمبر میں آپ کے ہاں اولاد ہوگی۔“

اس کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی اور دسمبر 1968ء میں میرا پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ اس کا جو نام ہم نے رکھا وہ خاصا لمبا ہے کیونکہ اس میں اس کے باپ، دادا اور اس ڈاکٹر کا نام بھی شامل ہے، جس کے علاج کی بدولت اسے اس دنیا میں آنے میں مدد ملی۔ مختصراً ہم اپنے اس بیٹے کو کارلو جونیئر کہتے ہیں۔ اس کے چار سال بعد میرا دوسرا بیٹا ایڈورآرڈو پیدا ہوا۔ یہ دونوں بچے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہیں اور ان کی آمد نے گویا میری دنیا اور میری شخصیت، دونوں کو مکمل کر دیا۔ تاہم میری شادی کا مسئلہ ابھی جوں کا توں تھا۔

میں اور کارلو اٹلی جاتے تو محفلوں وغیرہ میں بالکل الگ الگ جاتے اور ایک دوسرے سے لاتعلق نظر آتے، حالانکہ میرے دل میں قطعی چور نہیں تھا۔ میں دل و جان سے اپنے آپ کو کارلو کی بیوی اور کارلو خود کو میرا شوہر سمجھتا تھا لیکن اٹلی کا چرچ ہمیں یہ حق دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں کارلو کے دو بچوں کی ماں بن چکی تھی اور چرچ ابھی تک اسے میرا شوہر تسلیم نہیں کرتا تھا، کیونکہ پہلی بیوی سے اس کی طلاق نہیں ہوئی تھی۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اس کی پہلی بیوی گلیانا خود اس سے طلاق لینا چاہتی تھی۔ وہ تین مرتبہ چرچ میں طلاق کے لئے درخواست دے چکی تھی لیکن ہر بار اس کی درخواست مسترد ہو گئی تھی۔ شادی بیاہ، طلاق اور اس طرح کے بعض دوسرے مسائل جاتے تو عدالت میں ہی تھے لیکن ان کا فیصلہ چرچ کرتا تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ اٹلی میں آدھے لوگ ہمارے حامی اور پرستار تھے، ہمیں میاں بیوی تسلیم کرتے تھے اور آدھے ہمارے خلاف تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم گناہ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ لوگ ان چند چھوٹی موٹی مذہبی اور سماجی تنظیموں کے پروپیگنڈے سے متاثر تھے، جو اکثر ہمارے خلاف کوئی نہ کوئی مہم شروع کئے رکھتی تھیں۔ ہمیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ ان کا اصل مقصد اپنے نظریات کے پرچار کے بجائے ہمیں سیڑھی بنا کر شہرت حاصل کرنا تھا۔ بہرحال ہم ان کے سامنے مجبور تھے، کیونکہ اس قسم کی انجمنوں اور تنظیموں کو چرچ کی حمایت اور پشت پناہی حاصل ہوتی تھی۔

آنے والے برسوں میں گو کہ اٹلی میں شادی اور طلاق کے قوانین میں بہت سی ترامیم ہوئیں، اس سلسلے میں ایک ریفرنڈم بھی ہوا، جس کے بعد نہ صرف اٹلی کے عوام کے لئے شادی اور طلاق کے معاملات آسان اور قابل عمل ہو گئے بلکہ ہم جیسے بہت سے جوڑوں کی مشکلات بھی آسان ہو گئیں جو اصلاحات سے پہلے کسی حد تک پریشانی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ہماری پریشانی کا حل بہرحال اصلاحات اور ریفرنڈم وغیرہ سے پہلے ہی نکل آیا تھا اور دلچسپ بات یہ تھی کہ حل خود کارلو کی پہلی بیوی گلیانا نے نکالا۔ وہ بھی کارلو سے علیحدگی کی خواہاں تھی۔

اس حل کی طرف ہمارا ذہن ہی نہیں گیا تھا۔ گلیانا نے تجویز پیش کی کہ ہم تینوں چل کر کچھ عرصے کے لئے فرانس میں رہتے ہیں۔ میں نے اور کارلو نے چونکہ فرانسیسی فلم انڈسٹری کے لئے بھی کافی کام کیا تھا، اس لئے ہمیں آسانی سے فرانسیسی شہریت مل سکتی تھی۔ جب کارلو کو شہریت مل جاتی تو اس کی بیوی کو بھی خود بخود ہی فرانسیسی شہریت مل جاتی۔ جس کے بعد وہ فرانسیسی قوانین کے مطابق نہ صرف نہایت آسانی سے گلیانا کو طلاق دے سکتا تھا، بلکہ مجھ سے شادی بھی کر سکتا تھا جس کے بعد ہم باقاعدہ اور باضابطہ طور پر میاں، بیوی ہو جاتے۔ اٹلی کی حکومت اور عوام بھی دل میں خواہ کچھ بھی سوچتے، لیکن وہ ہمیں میاں، بیوی تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے۔

ہم نے اسی طریقے پر عمل کیا اور پیرس جا کر ایک شاندار اپارٹمنٹ کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ تھوڑے ہی دنوں میں ہماری توقعات کے مطابق سب کچھ ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد جب ہم تینوں پیرس سے واپس آئے تو گلیانا کو اس کی خواہش کے مطابق طلاق مل چکی تھی، جبکہ میں اور کارلو قانونی طور پر میاں، بیوی قرار پا چکے تھے۔ تینوں فریقین نے سکھ کی سانس لی۔ ہم نے پیرس میں بھی شادی کی، ایک شاندار تقریب منعقد کی اور اٹلی واپس آ کر بھی اس خوشی میں ایک بہترین تقریب کا اہتمام کیا۔ یہ دونوں تقریبات دنیا بھر کے میڈیا کی توجہ کا مرکز بنیں۔

میں اپنے ماضی کی بھول بھلیوں میں کچھ اور بھٹکتی ہوں تو مجھے وہ دن یاد آتا ہے جب میری ملازمہ نے آواز دے کر مجھے بتایا کہ میرے لئے چارلی چپلن کی فون کال ہے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ میں یہی سمجھی کہ کارلو یا پھر میرا کوئی شناسا مجھ سے مذاق کر رہا ہوگا اور اس نے ملازمہ کو اپنا نام چارلی چپلن بتایا ہوگا۔ چارلی چپلن اس وقت بوڑھے ہو چکے تھے اور بہت کم کام کر رہے تھے، کافی عرصے سے انہوں نے کوئی فلم نہیں بنائی تھی لیکن شوبز کی دنیا میں انہیں اب بھی ایک بادشاہ کا سا مقام اور عزت حاصل تھی۔

میں نے فون کے پاس جا کر ہچکچاتے ہوئے ریسیور اُٹھایا اور ذرا اٹکتے ہوئے ”ہیلو“ کہا۔ دوسری طرف سچ مچ چارلی چپلن تھے اور وہ مجھ سے ملنے کے لئے آنا چاہتے تھے۔ وہ مجھ سے ملاقات کا وقت مانگ رہے تھے۔ شدت جذبات سے میرا عجیب حال ہو گیا، میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دوں۔ بڑی مشکل سے میں صرف اتنا کہہ سکی کہ وہ جب چاہیں تشریف لا سکتے ہیں، ان سے ملنا میرے لئے اعزاز ہوگا۔

میں ان دنوں سوئٹزرلینڈ میں تھی اور گریگوری پیک کے ساتھ فلم "Arabesque" کی شوٹنگ کر رہی تھی۔ میں ایسکاٹ کے مقام پر کرائے کے ایک کاٹیج میں رہ رہی تھی۔ وہ 1965ء کا موسم خزاں تھا۔

ایک روز کال بیل بجنے پر میں نے دروازہ کھولا تو سامنے سفید بالوں والے چارلی چپلن کو کھڑے پایا۔ میں نے مسکرا کر ان کا استقبال کیا اور گردن خم کر کے انہیں تعظیم دی۔ پھر ایک طرف ہٹ کر انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ منہ سے میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکی۔ ان کے ایک ہاتھ میں میرے لئے گلدستہ تھا اور بغل میں ایک کتاب سی دبی ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کوئی اسکرپٹ تھا۔

اندر آ کر بیٹھنے کے بعد چارلی چپلن نے مجھے تکلفات میں اُلجھنے اور اپنی خاطر مدارت کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا۔ انہوں نے تقریباً بلا تمہید ہی بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”سینورا صوفیہ لورین! میرے پاس ایک طویل عرصے سے ایک اسکرپٹ شیلف پر رکھا ہوا ہے جس پر میرے فلم بنانے کی نوبت نہیں آسکی پھر میں نے تمہاری فلم "Yesterday Today And Tomorrow" دیکھی تو مجھے خیال آیا کہ تم اس فلم کے لئے کتنی موزوں ہو، جس کے اسکرپٹ کی میں بات کر رہا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ تم......!“

”میں آپ کی اس فلم میں کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔“ میں نے ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بے تابی اور جوش و خروش سے کہا جس پر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے اور انہیں اندازہ ہو گیا کہ میں ان کی کتنی بڑی مداح اور پرستار تھی۔

اس فلم کا اسکرپٹ انہوں نے پالیٹ گوڈرڈ کو بطور ہیروئن ذہن میں رکھ کر لکھا تھا، جو اپنے وقت کی ایک معروف اداکارہ تھی اور اب ان کی بہت سی سابق بیویوں میں سے ایک ہو چکی تھی۔ اس کی فلمیں "The Great Dictator" اور "The Diary of a Chambermaid" تو یقیناً فلم بینوں کے لئے ناقابل فراموش رہی ہوں گی۔ اب چارلی چپلن اس کی جگہ مجھے اپنی اس فلم میں کاسٹ کرنا چاہتے تھے جس کا نام انہوں نے "A Countess From Hong Kong" رکھا تھا۔

چارلی چپلن کے ساتھ کام کرنا دنیا کے ہر اداکار کا خواب تھا۔ ان کی طرف سے کسی کو فلم میں کام کرنے کی دعوت ملنا ایسا ہی تھا جیسے کسی ملک کی رعایا میں سے کسی کو بادشاہ سلامت نے اپنے دربار میں طلب کیا ہو۔ بھلا کون انکار کر سکتا تھا؟ ان کی طرف سے بلاوا آتا تو اداکاروں کے لئے ایک اعزاز تھا چہ جائیکہ وہ خود چل کر میرے گھر آئے تھے۔ وہ اگر اسکرپٹ کے بجائے مجھے ٹیلیفون ڈائریکٹری دے دیتے اور حکم دیتے کہ میں کیمرے کے سامنے اسے پڑھوں تو میں پڑھنا شروع کر دیتی۔

”فال آف دی رومن ایمپائر“ میں اسٹیفن بوائڈ کے ساتھ (1964ء)

اپنی اس مجوزہ فلم کے لئے ہیرو کے طور پر ان کے ذہن میں مارلن برانڈو کا نام تھا۔ چارلی چپلن ان دنوں ”ویوی“ کے علاقے میں اپنی فیملی کے ساتھ رہ رہے تھے۔ انہوں نے کارلو کے ساتھ مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ وہ رخصت ہونے لگے تو میں ان سے ان کا فون نمبر اور ایڈریس مانگتے مانگتے رہ گئی۔ مجھے خیال آ گیا کہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو خواہ دنیا کے کسی بھی کونے میں رہتے ہوں، انہیں تلاش کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ چارلی کی عمر اس وقت 76 برس تھی اور وہ ان کے زوال کا زمانہ تھا، مگر اس وقت بھی ان کا نام ان بے شمار لوگوں کے نام سے زیادہ وزن رکھتا تھا جن کے عروج کا دور چل رہا تھا۔

کارلو ان دنوں روم میں تھا۔ وہ جب سوئٹزرلینڈ آیا تو ہم دونوں چارلی چپلن سے ملنے ویوی گئے، جہاں وہ اپنی حالیہ اور نوجوان بیوی ”اونا“ کے ساتھ رہ رہے تھے، جو مشہور ڈرامہ نگار یوجین اونیل کی بیٹی تھی۔ ان کے اتنے سارے بچے تھے کہ میں انہیں گن نہیں سکی۔ ان کا گھر لیک جنیوا کے قریب تھا اور اس کے گرد اتنا بڑا باغ تھا کہ وہ کسی گھر کے باغیچے کے بجائے کوئی پارک معلوم ہوتا تھا۔

چارلی چپلن ہمیں کتنی اہمیت دے رہے تھے، اس کا اظہار انہوں نے یوں کیا کہ ہمارے لئے کھانا خود بنایا تھا۔ شوبز کے اس جینئس کا گفتگو کرنے کا انداز عجیب تھا۔ وہ فلم پر بات کرتے کرتے اچانک سیاست پر بات شروع کر دیتے تھے۔ بیچ میں انہیں کوئی قصہ یاد آ جاتا تو وہ چل پڑتا تھا۔ قصے کے دوران کوئی شخصیت یاد آ جاتی تھی تو اس کا تذکرہ شروع ہو جاتا تھا، تاہم اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ غضب کے داستان گو تھے اور خود ان پر بھی اپنی گفتگو کے جادو کا اثر ہو جاتا تھا۔

دوسری مرتبہ میں مارلن برانڈو کے ساتھ ان کے گھر گئی۔ اس وقت تک چارلی چپلن نے اپنے اسکرپٹ پر نظر ثانی کر لی تھی اور اس کا پرانا پن دور کرنے کے لئے جو تبدیلیاں کرنی ضروری تھیں، وہ انہوں نے کر لی تھیں۔ وہ ہم دونوں کو اسکرپٹ دکھانا چاہتے تھے۔ اسکرپٹ انہوں نے خود ہمیں پڑھ کر سنایا۔ ہر اداکار اور اداکارہ کی آواز بھی وہ خود ہی نکال رہے تھے۔ میں اور مارلن برانڈو سحر زدہ سے ہو کر ان کی زبانی اسکرپٹ سن رہے تھے۔ وہ صرف پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور اسکرپٹ رائٹر ہی نہیں ایک باکمال صداکار بھی تھے اور یہ کیسی ستم ظریفی تھی کہ اپنی ساری جوانی انہوں نے خاموش فلموں میں کام کرتے ہوئے گزار دی تھی، کیونکہ اس وقت تک سین کے ساتھ ساتھ مکالمے ریکارڈ کرنے کی تکنیک ہی دریافت نہیں ہوئی تھی۔

مارلن برانڈو بلاشبہ ایک وجیہ انسان اور شاندار اداکار تھا لیکن ان دنوں وہ کچھ مضطرب اور پریشان نظر آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے ماحول اور اپنے گرد و پیش میں صحیح طرح فٹ نہیں ہے۔ فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی تو میں حسب عادت پہلے ہی دن بالکل ٹھیک وقت پر سیٹ پر پہنچ گئی اور مجھے اپنے مکالمے بھی اچھی طرح یاد تھے۔ تمام تیاریاں مکمل تھیں، دیگر اداکار اور بہت سے ایکسٹرا بھی موجود تھے لیکن مارلن برانڈو کا کچھ پتا نہیں تھا۔

اس کے انتظار میں کچھ دیر گزر گئی تو چارلی چپلن نے مضطرب لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ”صوفیہ! تمہیں معلوم ہے برانڈو کہاں ہے؟“

ظاہر ہے میرا جواب نفی میں تھا۔ چارلی چپلن اس شخص کی سی بے چینی کے ساتھ اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے، جس کی بیوی لیبر روم میں ہو اور کوئی اطلاع نہ آ رہی ہو کہ ان کے ہاں بیٹا ہوا ہے یا بیٹی......؟ ہر تین منٹ بعد وہ گھڑی دیکھتے پندرہ منٹ بعد مارلن برانڈو اطمینان سے ٹہلتا ہوا آیا۔ وہ بالکل تازہ دم اور بے فکر دکھائی دے رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ جتنا بڑا اسٹار تھا، اس نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اس کا پندرہ منٹ تاخیر سے سیٹ پر پہنچنا کوئی خاص بات ہے۔ چارلی چپلن اس کے پاس پہنچے۔ وہ قد میں مارلن برانڈو سے کافی چھوٹے تھے، لیکن انہوں نے جیسی شعلہ بار نظروں سے برانڈو کی طرف دیکھا، ان کی وجہ سے برانڈو ان کے سامنے چھوٹے لگنے لگے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد چارلی چپلن نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ”مسٹر برانڈو! اگر آج کے بعد بھی تمہارا اتنا تاخیر سے شوٹنگ پر پہنچنے کا کوئی ارادہ ہے تو براہ کرم تم آنے کی زحمت ہی نہ کرنا۔“

(جاری ہے)

آخری قسط

چارلی چیپلن کی بات سن کر مارلن برانڈو کی حالت کچھ ایسی ہوگئی جیسے کسی غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔ اس نے منمنانے کے سے انداز میں معذرت کی اور بڑی مشکل سے اپنا سین شوٹ کرایا۔ اس دن کے بعد وہ کبھی شوٹنگ پر لیٹ نہیں آیا۔ چارلی چیپلن ایک طویل عرصے بعد فلم بنا رہے تھے اور انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کام کرنا بھول گئے ہیں تاہم جلد ہی ان کی مہارت اور اعتماد لوٹ آیا۔ ان کے ساتھ کام کرنا میرے لئے ایک یادگار تجربہ تھا اور اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب اپنی پرفارمنس پر میں نے ان سے داد وصول کی۔

1965ء میں ہی میں نے پال نیومین کے ساتھ Lady L میں کام کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ پال نیومین سیٹ پر اپنے ساتھ بہت سے چھوٹے چھوٹے تولیے لے کر آتا تھا۔ ایک روز میں اس سے اس کی وجہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے معذرت خواہانہ سے لہجے میں بتایا۔ ''دراصل میرے ہاتھوں پر پسینہ بہت آتا ہے۔ ہر تھوڑی دیر بعد مجھے ہاتھ صاف کرنا پڑتے ہیں۔''

چارلی چیپلن، مارلن برانڈو اور پال نیومین کے علاوہ بھی میں نے 1960ء کی دہائی میں بہت سے ایسے سپر اسٹارز کے ساتھ کام کیا، جن کی شہرت بین الاقوامی تھی۔ ان میں گریگوری پیک، ایلیک گنیس، عمر شریف، چارلٹن ہسٹن اور پیٹر سیلرز شامل تھے۔ عمر شریف کھانا پکانا بہت اچھا جانتے تھے۔ ایک روز انہوں نے شوٹنگ کے دوران میرے ساتھ کھانا پکانے کا مقابلہ کرلیا۔ اس موقعے پر انہوں نے بطور خاص اپنی والدہ کو بھی بذریعہ ہوائی جہاز مصر سے بلوا لیا۔ جنہوں نے ایک مصری ڈش تیار کرنے میں عمر شریف کی مدد کی۔ میں نے ایک اطالوی ڈش تیار کی۔ مقابلہ کیا تھا، بس ایک قسم کا شغل تھا۔ بہت لطف رہا۔ بیسیوں افراد شوٹنگ میں حصہ لے رہے تھے۔ وہ سب بہت لطف اندوز ہوئے۔

پیٹر سیلرز کے ساتھ The Millionress کی شوٹنگ کے دوران میں انگلینڈ کے ایک دیہی علاقے میں تھی، جہاں قیام کے لئے مجھے ایک کاٹیج دی گئی تھی۔ اس کاٹیج سے ایک رات میرے تمام قیمتی زیورات چوری ہوگئے۔ اس زمانے میں بھی وہ لاکھوں ڈالر مالیت کے زیورات تھے اور چرانے والا ایک اس قسم کا پراسرار کردار تھا جیسے ہم قصے کہانیوں میں پڑھتے ہیں۔ اس نے اپنا نام ''دی کیٹ'' رکھا ہوا تھا۔ وہ ایسی جگہوں سے بیش قیمت چیزیں چوری کر کے لے جاتا تھا جہاں چوری کرنا تقریباً ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ وہ وہاں اپنا یہ فرضی نام یعنی ''دی کیٹ'' بھی کسی نہ کسی انداز میں لکھا ہوا چھوڑ جاتا تھا۔ پولیس اپنی تمام تر جدوجہد کے باوجود اس افسانوی کردار کو پکڑنے یا اس کی اصلیت جاننے میں ناکام تھی۔

عورت خواہ کہیں کی بھی ہو اور کسی بھی حیثیت کی مالک ہو، اپنے زیورات سے محروم ہونا اس کے لئے بہت بڑا صدمہ ہوتا ہے۔ کارلو پونٹی سمیت ہر ایک نے مجھے بہت تسلیاں دیں لیکن میری حالت خراب رہی۔ میں جب بھی فارغ ہوتی، بستر پر پڑی روتی رہتی۔ پھر دو دن کے دوران دو ایسی باتیں ہوئیں جنہوں نے مجھے میرا صدمہ بھلا دیا۔ ایک تو پورے فلمی یونٹ نے مجھے بتائے بغیر آپس میں رقم جمع کر کے میرے لئے ہیرے کا ایک قیمتی بروچ خریدا اور ایک مخملیں باکس میں، تحفے کے طور پر مجھے پیش کیا۔ اس کے ساتھ منسلک کارڈ پر لکھا تھا:

'ہم آپ کے سارے نقصان کی تلافی تو نہیں کر سکتے لیکن یہ حقیر سا تحفہ آپ کو صرف یہ بتانے کے لئے ہے کہ ہم آپ کے اس دکھ میں شریک ہیں۔'

یہ پڑھ کر میری آنکھوں میں مزید آنسو آگئے لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ اسی دوران میرا پرانا ساتھی اداکار وٹوریو اٹلی سے آیا اور اسے میرے زیورات کی چوری اور میری حالت کا پتا چلا تو وہ مجھے تسلی دینے آیا۔ اس کی باتیں میں کبھی نہیں بھولوں گی۔ اس نے کہا۔ ''صوفیہ! دولت، شہرت، زیور، جائداد، سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ کیا تم بھول گئیں کہ تم نے اور میں نے کیسی غربت میں بھی زندگی گزاری ہے؟ کیا اس وقت وہ زیور تمہارے پاس تھے؟ کیا ان کے بغیر تمہاری زندگی نہیں گزر رہی تھی؟ جب یہ زیور تمہارے پاس تھے تب بھی زندگی گزر رہی تھی۔ اب نہیں ہیں، تب بھی زندگی گزر رہی ہے۔ کل پھر تمہارے پاس شاید اس سے بھی زیادہ زیور آجائیں۔ زندگی تب بھی گزرتی رہے گی۔ میں آئے دن جوئے خانوں میں لاکھوں ڈالر ہار جاتا ہوں۔ میں کبھی ان کے بارے میں سوچتا بھی نہیں......''

پھر اس نے ایک ایسی بات کہی جس نے واقعی میرے بہتے ہوئے آنسو روک دیئے۔ میں ایک اداکار سے ایسی فلسفیانہ اور دانشورانہ بات کی توقع نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''کبھی کسی ایسی چیز کے لئے آنسو مت بہاؤ جو تمہارے لئے آنسو نہیں بہا سکتی۔''

کارلو جونیئر کی پیدائش نے گویا میری ذات کو مکمل کردیا تھا۔ ماں بننے کا تجربہ کیا معنی رکھتا ہے، یہ کوئی ماں ہی سمجھ سکتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے اسپتال میں جس نرس نے کارلو جونیئر کی پیدائش کے دوران ڈیوٹی دی تھی اور پھر اس کی دیکھ بھال کی تھی، وہ اسی زمانے سے میرے پاس ملازم ہوگئی تھی۔ اسی نے میرے دونوں بچوں کی پرورش کی ہے اور اسے ہمارے ساتھ رہتے ہوئے پچاس سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے۔ نصف صدی سے وہ ہمارے گھر کی ایک فرد ہے۔ اس کا نام 'آئینز' تھا لیکن میں نے 'نینی' رکھ دیا تھا اور اب وہ بھی اپنا اصل نام بھول چکی ہے۔

1962ء میں ہم نے روم کے مضافات میں ایک حویلی خریدی تھی جو سولہویں صدی میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس کی قدامت ہی اس کی خوبصورتی تھی۔ اس کے چاروں طرف باغ تھا اور اس کی دیواروں پر آرٹ کے نادر اور بیش قیمت نمونے آویزاں تھے۔ 1964ء میں گوکہ ہم نے پیرس میں آکر رہائش اختیار کرلی تھی لیکن ہمیں جب بھی موقع ملتا تھا، ہم اٹلی جاتے تھے اور اپنی اسی حویلی میں قیام کرتے تھے۔ میں اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں۔ خدا نے مجھے ہر نعمت سے نوازا اور ہر خوشی سے آشنا کیا۔

اپنی قدیم اور خوبصورت رومن حویلی مجھے بہت اچھی لگتی تھی لیکن اچھی سے اچھی چیز کا بھی کوئی نہ کوئی تاریک پہلو ہوتا ہے۔ اس حویلی کا مسئلہ یہ تھا کہ یہ روم سے آدھے گھنٹے کی ڈرائیو پر تھی اور ویرانے میں واقع تھی۔ اس کے آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی، اس لئے یہ آسانی سے جرائم پیشہ افراد کی نظر میں اور زد میں آجاتی تھی۔ ایک بار تو ایک پاگل بھی حویلی میں گھس آیا اور سوئمنگ پول تک آپہنچا۔ وہ بری طرح چیخ چلا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں بہت سارے کاغذ تھے جنہیں آگ لگا کر وہ ان کے ذریعے حویلی کی ہر چیز کو جلا دینا چاہتا تھا۔ میں نے اور کارلو پونٹی نے پیار اور تحمل سے اسے سمجھایا بجھایا تو وہ کچھ ٹھنڈا ہوگیا۔ وہ پرسکون تو نظر آنے لگا لیکن اس کی یہ تکرار جاری تھی کہ ''سچی'' اس کا بیٹا ہے اور وہ اسے ہر حال میں اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔ سچی اصل میں ہمارے بیٹے کارلو جونیئر کی عرفیت تھی لیکن اس ذہنی مریض اور اجنبی کو نہ جانے کیسے معلوم ہوگئی تھی۔

آخرکار ہمیں اس کو پولیس کے حوالے کرنا پڑا اور تب پتا چلا کہ وہ پاگل خانے سے بھاگا ہوا تھا۔

صرف یہی نہیں، یہاں سے دو مرتبہ جرائم پیشہ لوگوں نے کارلو پونٹی کو اغوا کرنے کی بھی کوشش کی۔ وہ تو غنیمت تھا کہ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود کارلو ایک پھرتیلا اور حاضر دماغ آدمی تھا، اس لئے ان بدمعاشوں کے قابو میں آنے سے بچ گیا اور پھر پولیس بھی موقعے پر پہنچ گئی۔ ان دو تین واقعات کے بعد ہم نے حویلی میں آنا بہت کم کردیا۔ ہم زیادہ تر پیرس والے اپارٹمنٹ میں ہی رہنے لگے لیکن ہم نے حویلی کو بیچا نہیں۔ ہم دونوں میاں بیوی کو اس حویلی سے عشق ہوگیا تھا۔

1973ء میں کارلو پونٹی نے رچرڈ برٹن کو اپنی فلم The Voyage میں کام کرنے کی دعوت دی تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ روم آکر ہماری حویلی میں ہی ٹھہرے گا کیونکہ ہوٹلوں میں رپورٹر اور پاپا رازی فوٹوگرافر اسے چین سے نہیں رہنے دیتے تھے۔ ان دنوں الزبتھ ٹیلر سے اس کے تعلقات سخت تکلیف دہ چل رہے تھے، اس لئے رپورٹر اس کا اور بھی زیادہ پیچھا کرتے تھے اور ان کی باتوں سے اسے اور بھی زیادہ تکلیف ہوتی تھی۔ وہ ان دنوں شراب نوشی چھوڑنے اور پرہیزی خوراک کی عادت ڈال کر اپنی صحت ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہمارے ہاں حویلی میں ایک الگ مہمان خانہ موجود تھا، اس لئے اسے ٹھہرانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اکیلا نہیں آیا۔ پورا ایک قافلہ اس کے ساتھ تھا۔ ایک ڈاکٹر، نرس، سیکرٹری، باڈی گارڈز وغیرہ اس کے ساتھ تھے۔ جلد ہی وہ ہمارے گھر کا ایک فرد بن گیا۔ میرا بیٹا کارلو جونیئر تو اس سے بہت ہی مانوس ہوگیا اور وہ بھی کارلو سے بہت پیار کرنے لگا تھا تاہم اس کے پاس بات کرنے کے لئے زیادہ تر ایک ہی موضوع ہوتا تھا اور وہ تھی اس کی، نیلی آنکھوں والی قلوپطرہ...... یعنی الزبتھ ٹیلر...... وہ مجھ سے اکثر اسی کے بارے میں باتیں کرتا اور میں صبر و تحمل سے سنتی۔

رچرڈ برٹن ایک کان کن کا بیٹا تھا اور تیرہ بہن بھائیوں میں اس کا نمبر بارہواں تھا۔ اس نے کچھ اچھے حالات میں پرورش نہیں پائی تھی لیکن اس کی خوش قسمتی تھی کہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہ آکسفورڈ یونیورسٹی تک پہنچ گیا تاہم اس نے وہاں ڈرامے کی تعلیم حاصل کی۔ وہ زندگی بھر فلم اور تھیٹر کے درمیان تقسیم رہا اور اپنے بارے میں کبھی فیصلہ نہیں کرپایا کہ ان دونوں میں سے کس کے لئے وہ زیادہ موزوں تھا۔ نوجوانی سے ہی اسے زیادہ پینے پلانے کی عادت تھی اور عورتوں سے دوستیاں بھی بہت رہتی تھیں۔ نوجوانی میں تو وہ بہت ہی وجیہہ تھا، اس لئے خواتین بھی اس پر جلد مہربان ہوجاتی تھیں۔

1964ء میں ''قلوپطرہ'' (Cleopatra) کے سیٹ پر کام کرتے ہوئے وہ الزبتھ ٹیلر کے عشق میں گرفتار ہوا تھا اور اس سے شادی کرنے کے لئے اس نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ الزبتھ سے اس کی شادی 1973ء تک چلی اور ان کے درمیان طلاق ہوگئی۔ 1975ء میں دوبارہ شادی اور 1976ء میں دوبارہ طلاق کے ذریعے انہوں نے فلمی دنیا میں ایک حیرت انگیز مثال قائم کی۔ اس میں شک نہیں کہ رچرڈ ایک ذہین آدمی تھا۔ بہت اچھی گفتگو کرتا تھا۔ ادبی گفتگو بھی کرلیتا تھا۔

وہ نومبر 1974ء کی ایک شام تھی جب میری بہن ماریا نے مجھے فون کر کے اطلاع دی کہ ہمارے والد اسپتال میں آخری سانسیں لے رہے تھے۔ میں فوراً اسپتال پہنچی۔ میں اور ماریا کے علاوہ ایک جرمن عورت ان کے بیڈ کے پاس کھڑی تھی جو ان کی زندگی کے آخری دور میں ان کے ساتھ رہ رہی تھی۔ پاپا نے کبھی میری اور ماریا کی زندگی میں باپ جیسا اور ہماری ماں کی زندگی میں شوہر جیسا کردار ادا نہیں کیا تھا لیکن وہ بہرحال میرے والد تھے۔ میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں، میری طرف دیکھا اور شاید کچھ کہنا چاہا لیکن آواز نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ چند منٹ بعد ان کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ میں نے رونا چاہا لیکن میری آنکھوں سے آنسو نہیں نکلے۔

فروری 1977ء میں ہماری حویلی پر چھاپہ پڑا۔ اٹلی کی خفیہ ایجنسی سرکاری وکیل کے اس الزام پر حرکت میں آئی تھی کہ کارلو فرانسیسی شہری تھا لیکن وہ اٹلی، امریکا اور انگلینڈ وغیرہ میں فلمیں بناتا تھا اور غیرقانونی طور پر زرمبادلہ ادھر سے ادھر لاتا لے جاتا رہتا تھا۔ میں محض ایک اداکارہ تھی۔ مجھے کاروباری اور مالیاتی قوانین کا کچھ پتا نہیں تھا۔ یہ ایک نہایت پیچیدہ مقدمہ تھا۔ اس کے دوران ایک بار تو مجھے پیرس جاتے ہوئے، روم کے ایئرپورٹ پر ہی روک لیا گیا اور اس طرح پوچھ گچھ کی گئی جیسے میں کوئی بہت بڑی مجرم تھی۔ میرے وکیلوں نے آکر میری جان چھڑائی۔ اس مقدمے میں ایک عدالت نے تو کارلو پونٹی کو چار سال کی سزائے قید بھی سنادی۔ گوکہ بعد میں وہ بری ہوگیا لیکن ہمارے لئے پورا ایک سال ایک ڈراؤنے خواب کی طرح گزرا۔ یہ ایک ایسی افتاد اچانک ہمارے سروں پر آسمانی بجلی کی طرح گری تھی جس کا ہمیں وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

اسی طرح مالیاتی اور قانونی مشیروں کی غلطی کے باعث مجھے بھی ایک مصیبت جھیلنا پڑی اور بے پناہ شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ میں جتنا عرصہ باہر رہی تھی، اپنی آمدنی پر وہاں ٹیکس دیتی رہی تھی لیکن میرے ایک نئے وکیل نے ''آ بیل مجھے مار'' کے مصداق اٹلی میں بھی مجھے اس الزام میں پھنسوا دیا کہ میں نے اس عرصے میں اپنے ملک میں ٹیکس کیوں ادا نہیں کیا۔ اس جرم میں میری غیرحاضری میں مجھے ایک ماہ کی سزائے قید سنادی گئی۔ میں اس وقت پیرس میں تھی۔ اگر میں یہ سزا کاٹنے کے لئے اٹلی نہ آتی تو پھر مجھے ساری زندگی باہر ہی رہنا پڑتا۔ میں کبھی اپنے وطن نہیں آسکتی تھی...... اور یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ میں وطن آگئی اور میں نے ایک ماہ کی جیل کاٹی جس پر ساری دنیا میں تہلکہ مچ گیا اور وہ جیل بھی دنیا بھر میں مشہور ہوگئی، جہاں مجھے رکھا گیا۔

1980ء کی دہائی میں میرا کیریئر عروج پر تھا تو میں نے اور کارلو نے سوئٹزرلینڈ میں سکونت پذیر ہونے کا فیصلہ کیا۔ 10 جنوری 2007ء کو 94 سال کی عمر میں کارلو پونٹی سوئٹزرلینڈ میں ہی انتقال کرگیا۔ عمر کے آخری حصے میں اسے ذیابیطس ہوگئی تھی۔ میری زندگی کی کہانی پریوں کے دیس کی کسی کہانی سے کم نہیں۔ اس میں خوشیاں بھی ہیں اور غم بھی۔ کامیابیاں بھی ہیں اور ناکامیاں بھی...... تاہم کارلو کی موت کا صدمہ سب سے زیادہ شدید تھا۔ میں نے یک لخت اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کیا۔ اگر مجھے سہارا دینے کے لئے میرے دونوں بچے موجود نہ ہوتے تو شاید میرے اعصاب بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ جاتے۔ میرے کئی پرانے ساتھی اداکار، پروڈیوسر اور ڈائریکٹرز جن سے میرے دوستانہ مراسم تھے، اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ احساسِ تنہائی کے علاوہ میرے دل کے کسی حصے میں ایک مستقل اور بے عنوان افسردگی جاگزیں ہوچکی ہے لیکن زندگی کا سفر بہرحال جاری رہتا ہے، سو میرا سفر بھی جاری ہے۔ نہ جانے کب میرا بھی بلاوا آجائے۔ مجموعی طور پر میں 98 فلموں میں کام کرچکی ہوں اور اس عمر میں بھی مجھے کوئی نہ کوئی رول کرنے کے لئے بلاوے آتے رہتے ہیں لیکن میں معذرت کرلیتی ہوں۔ 2014ء میں میری آخری فلم Human Voice ریلیز ہوئی تھی۔ زندگی میں اب جتنی بھی دلکشی اور خوشیاں باقی ہیں وہ صرف میرے بچوں اور ان کے بچوں کے دم سے ہیں۔

ایک بار میری کمسن پوتی نے مجھ سے پوچھا۔ ''دادی آپ بڑی ہو کر کیا بنیں گی؟'' میں اس کے اس معصوم سوال کے جواب میں صرف ہنس کر رہ گئی۔ اب میں اسے کیا بتاتی کہ مجھے شاید جتنی بڑی ہونا تھا، میں ہوچکی ہوں، مجھے جو بننا تھا، بن چکی ہوں، اب تو بس صرف ایک بلاوے کا انتظار ہے۔